طلوع اسلام

یکم اکتوبر سنہ ۱۹۵۵ء

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوع اسلام

جلد ۸	ہفتہ ــــ یکم اکتوبر سنہ ۵۵ء	نمبر ۳۵

سلوگن Page 3
کشمیر کی پکار Page 4
معاہدہ بغداد Page 5
تاریخی شواہد Page 7
اسلام کی سرگزشت Page 8
مجلس اقبال Page 9
عورت کا قرآن Page 10
طاہرہ کے نام Page 11
اسلام پر ہندو تہذیب کے اثرات Page 14
باب المراسلات Page 16
حقائق و عبر Page 17
نقد و نظر Page 18

اسلامی نظام

اسلامی مملکت کا بنیادی اصول کیا ھے اور اسلامی نظام کیسے قائم ھوسکتا ھے؟ اسکے جواب میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنھوں نے فکر و نظر کی نئی راھیں کھولدی ھیں ۔ قیمت دو روپے ۔

اسباب زوال امت

مسلمانوں کی ھزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ھے کہ ھمارا مرض کیا ھے اور علاج کیا ۔

ضخامت ۱۵۰ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ۔

فردوس گم گشتہ

جناب پرویز کے ان مضامین کا مجموعہ جنھوں نے قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاھوں کا زاویہ بدل دیا ھے ۔ مفہوم کے علاوہ اگر خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھئے تو اردو زبان کی بہت کم کتابیں اس پایہ کی دکھائی دینگی ۔

بڑا سائز ۔ ضخامت قریب چار سو صفحات کتابت و طباعت دیدہ زیب کاغذ سفید جلد مضبوط ۔ گرد پوش حسین ۔
قیمت چھ روپے ۔ علاوہ محصولڈاک ۔

سلیم کے نام خطوط

ان خطوط میں ملت کے اس نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مخاطب کیا گیا ھے جو مشرق و مغرب کے تصادم کے بعد ملوکیت کے وضع کردہ غلط مذھبی تصورات سے متنفر ھوتے ھوتے اسلام اور اسکے سرچشمۂ حیات قرآن ھی سے ھاتھ دھو چلا تھا ۔ عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کیگئی ھے کہ محسوس ھی نہیں ھوتا کہ ھم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رھے ھیں ۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکہ آرا مسائل حل کرکے رکھ دئے گئے ھیں جنھیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جاسکا تھا ۔ یہ خطوط ملک کے گوشہ گوشہ سے خراج تحسین وصول کر چکے ھیں ۔ قرآن کی روشنی اور محترم پرویز صاحب کا بصیرت افروز قلم ۔ بڑا سائز ضخامت سوا چار سو صفحات ۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب کاغذ سفید گرد پوش مصور مشرق جناب چغتائی کے قلم کا حسین مرقعہ ۔ قیمت چھ روپے علاوہ محصولڈاک ۔

قرآنی دستور

اس میں پاکستان کیلئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ھے اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ھے ۔

ضخامت دو سو چوبیس صفحات
قیمت دو روپے آٹھ آنے ۔

اسلامی معاشرت

مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ، رھنے سہنے کا ڈھنگ ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ھر اسلوب قرآنی آئینے میں ۔

ضخامت ۱۹۲ صفحات قیمت دو روپے ۔

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوع اسلام

جلد ۸ — ہفتہ — یکم۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء — نمبر ۳۵

سلوگن

(SLOGANS)

اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم

(بعض چند مبہم الفاظ جو تم نے اور تمہارے آباء نے وضع کر رکھے ہیں)

جب زندگی حیوانی سطح سے آگے بڑھ کر انسانی سطح پر پہنچی تو اس میں چند ایسی خصوصیات پیدا ہوئیں جو اس سے پہلی ارتقائی منزلوں میں کہیں نہیں پائی جاتی تھیں۔ یہ خصوصیات تھیں۔ (۱) اختیار و ارادہ۔ (۲) سمجھنے سوچنے کی صلاحیت اور (۳) زبان۔ حیوانات کو نہ زبان ملی ہے نہ فکری صلاحیت۔ اور نہ اختیار و ارادہ۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو یہ تینوں صلاحیتیں باہدگر مربوط ہیں اور ان کا ایک دوسرے سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ایک شخص آپ سے کوئی بات کہتا ہے آپ اُس کی بات کو سُن کر اس پر غور کرتے ہیں اور اس طرح ایک نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے لئے ایک فیصلہ کرتے ہیں اور اس فیصلہ پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اس میں زبان، فکر اور فیصلہ کی تینوں صلاحیتیں آجاتی ہیں۔ یہی صلاحیتیں وجہ شرف انسانیت ہیں۔ انہی سے اقوام کی ترقی وابستہ ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک صلاحیت بھی مفقود ہو جائے تو وہ قوم انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر آجاتی ہے۔ قرآن نے ان صلاحیتوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور جو قوم اپنے آپ کو ان سے محروم کر لیتی ہے اسے جہنمی قرار دیا ہے۔

لیکن جس طرح انسان نے اپنی مفاد پرستیوں کے پیش نظر فطرت کے دیگر عطیات کا ناجائز استعمال کیا اسی طرح اس نے ان خصوصیات کبریٰ کو بھی اس درجہ مسخ اور پامال کیا کہ ان کا مقصود فنا اور مفہوم یکسر باطل ہو کر رہ گیا۔ اس مفاد پرست گروہ نے، دوسرے انسانوں سے سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت کو سلب کرنے کے لئے تقلید کا مسلک وضع کیا۔ اس سے مُراد یہ ہے کہ انسان اپنی عقل و فکر سے ہرگز کام نہ لے اور بلا سوچے سمجھے دوسروں کے پیچھے چلتا جائے، اور جو کچھ اسے پہلی نسلوں سے وراثت میں ملے اسے فطرت کے اٹل قوانین کی طرح غیر متبدل سمجھے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی انسان خود سوچنے کے بجائے تقلید کا مسلک اختیار کرے تو اس سے اختیار و ارادہ کی صلاحیت خود بخود سلب ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کے بعد وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے فیصلہ سے نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی ہر حرکت مشین کی طرح غیر اختیاری ہوتی ہے۔ وہ جس راستہ پر چلتا ہے اس کا رخ اس نے اپنی مرضی سے آپ متعین نہیں کیا ہوتا۔ وہ رُخ دوسروں کا مقرر کردہ ہوتا ہے۔ اور جب یہی مسلک کوئی قوم اختیار کر لیتی ہے تو اس سے بھی رفتہ رفتہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیت اور اپنے اختیار و ارادہ سے معاملات طے کرنے کی استعداد سلب ہو جاتی ہے۔

اندھی تقلید، جو کچھ زندگی کے دوسرے شعبوں میں کرتی ہے وہی کچھ زبان کے بارے میں بھی کرتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، جب ایک شخص آپ سے کوئی بات کہتا ہے، تو آپ ان الفاظ پر غور کرتے ہیں۔ اور اس طرح اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تقلیدی مسلک میں یہ صورت بھی بالکل بدل جاتی ہے۔ آپ الفاظ کو سُن کر اُن پر غور و فکر نہیں کرتے بلا سوچے سمجھے، ان الفاظ کا ایک خاص اثر آپ کے جذبات پر براہ راست مرتب ہو جاتا ہے، اور آپ ان جذبات سے مغلوب ہو کر خود بخود کچھ کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب آپ کو کوئی شخص گالی دیتا ہے تو آپ اس گالی کے الفاظ پر غور و فکر نہیں کرتے۔ ہوتا یہ ہے کہ اُدھر وہ الفاظ آپ کے کان میں پڑے اور ادھر آپ کے جذبات بھڑک اُٹھے اور اس کے بعد آپ وہ کچھ کر گزرے جس پر آپ کو بعد میں خود ہی متاسف اور نادم ہونا پڑا۔ اس پورے عمل میں غور و فکر اور اختیار و ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بعینہٖ اسی طرح، مفاد پرست گروہ جو عوام کو اپنے پیچھے لگانا چاہتا ہے، کرتا یہ ہے کہ کچھ نہایت حسین اور خوش آیند الفاظ وضع کرتا ہے مختلف طریقوں سے لوگوں کو ان کا اس طرح عادی بنا دیتا ہے کہ اُدھر یہ الفاظ کان میں پڑے اور ادھر ان کے جذبات مشتعل ہوئے۔ اس طرح یہ گروہ عوام کو ہمیشہ ایک گہرے فریب میں رکھتا ہے۔ ان پر اپنا صحیح مقصد کبھی واضح نہیں ہونے دیتا اور انہیں ان الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھائے رکھتا ہے جن کا متعین مفہوم ان کے سامنے کبھی نہیں آنے دیتا۔ دور حاضر کی مکیاولی سیاست میں اس قسم کے الفاظ کو سلوگن (یا نعرہ) کہتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ سلوگن کی ابتدا اس لئے ہوئی تھی کہ ایک لمبی چوڑی بات کو سمٹا کر دو تین الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ یہ ایجاز و ارتکاز بڑی مفید چیز تھی۔ اس سے زندگی کا سفر مختصر ہو جاتا ہے۔ لیکن آج کل ان نعروں سے قطعاً یہ مقصد نہیں ہوتا۔ یہ نعرے چند مبہم الفاظ ہوتے ہیں جن کا مفہوم جان بوجھ کر غیر متعین رکھا جاتا ہے اور ان کے سحر آفریں اثر سے عوام کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت کو اس طرح مفلوج کر دیا جاتا ہے جس طرح ہپناٹزم (عمل تنویم) کا عامل اپنے معمول کو بے حس کر دیتا ہے۔ یہ نعرے یوں تو دنیا کی تمام قوموں اور ملکوں میں رائج ہیں۔ لیکن پاکستان میں ان کا استعمال بڑی کثرت اور خصوصیت سے کیا جا رہا ہے۔ پاکستان ایک سرزمین کا نام ہے جسے مسلمانوں نے اس لئے حاصل کیا تھا کہ وہ یہاں اپنے تصورات حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ارکان سیاست اور ارباب مذہب عوام سے ان تصورات کے پورا کرنے کے وعدے کرتے ہیں لیکن دونوں کی کوشش یہ ہے کہ ان تصورات کا کوئی متعین مفہوم عوام کے سامنے نہ آنے پائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے چند سلوگن وضع کر رکھے ہیں جنہیں یہ حضرات باربار دہراتے رہتے ہیں اور اس طرح ان سے عمل تنویم کا کام لیتے ہیں۔ چونکہ ہمارے ارباب سیاست کی زبان اب تک انگریزی ہے اس لئے ان کے ہاں یہ سلوگن انگریزی زبان میں سنائی دیتے ہیں۔ مثلاً اسلامک آئیڈیالوجی۔ اسلامک سوشلزم۔ اسلامک ڈیموکریسی۔ سوشل جسٹس۔ اکوالیٹی (مساوات)، فریٹرنٹی (اخوت) برادر ہڈ (برادری) وغیرہ مسلسل آٹھ برس سے ان الفاظ کو پلیٹ فارموں سے، اسمبلی کے ایوان سے، حکومت کی مسندوں سے، اخباری بیانات سے، ریڈیو کی نشرگاہوں سے۔ ملک کے اندر اور باہر، ہر مقام سے مسلسل اور متواتر سنتے چلے آرہے ہیں۔ ان لیڈران قوم میں سے ہر جانے والا ان الفاظ کو دہراتا ہوا چلا جاتا ہے اور اس کی جگہ نیا آنے والا انہیں دُہرانا شروع کر دیتا ہے لیکن ان میں سے کسی نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے اور وہ مفہوم عملی شکل میں کس طرح لایا جائے گا

ان الفاظ کو بار بار دہرانے سے عوام کو اس کا عادی بنا دیا گیا ہے کہ ادھر یہ الفاظ ان کے کان میں پڑے اور ادھر ان کی زبان سے غیر شعوری طور پر "نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر" کی فلک شگاف صدائیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ نہ انہیں یہ معلوم کہ ہمارے ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ نہ انہیں یہ پتہ کہ "اللہ اکبر" کیوں کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

دوسری طرف ہمارے ارباب مذہب ہیں۔ انہوں نے بھی اس میکیاؤلی حربہ سے کچھ کم فائدہ نہیں اٹھایا۔ بلکہ ایک طرح دیکھا جائے تو وہ اس سے اور بھی زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس لئے کہ عوام سیاسی لیڈروں کے مقابلہ میں مذہبی راہنماؤں کے ان الفاظ سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اور ان کی آواز سے ان کے جذبات بڑی تیزی سے مشتعل ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں سے اس قسم کے سلوگن دہرائے جاتے ہیں۔ مثلاً اسلامی دستور۔ شرعی نظام۔ اقامت دین۔ صالح نظام۔ کتاب و سنت۔ اسلامی تہذیب۔ اسلامی تمدن۔ اعلائے کلمۃ الحق۔ وغیرہ۔ جس طرح ارباب سیاست نے اپنے نعروں کے مفہوم کو کبھی متعین ہونے نہیں دیا اسی طرح ان ارباب شریعت نے ان مقدس الفاظ کو بھی آج تک شرمندۂ معنی نہیں ہونے دیا۔ ان الفاظ کی سحر آفرینی سے عوام کے جذبات کو تیز سے تیز تر کیا جاتا ہے اور یہی وہ قوت ہے جس کے بل بوتے پر یہ لوگ اپنے مخالفین کو دھمکاتے اور اپنے مقصد کو بروئے کار لاتے چلے جا رہے ہیں۔

آپ سوچئے کہ ان نعروں نے قوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ یہ وہ الفاظ ہیں جن کے معنی متعین نہیں، اس لئے فطرت نے جس مقصد کے لئے انسان کو زبان یا قوت بیان عطا کی تھی ان سے وہ مقصد یکسر فوت ہو جاتا ہے۔ ان الفاظ کی اپیل براہ راست جذبات سے ہوتی ہے اس لئے قوم سے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت، جو وجہ تفخرِ انسانیت ہے، رفتہ رفتہ مفقود ہو گئی۔ چونکہ ان نعروں سے قوم کو اندھی تقلید سکھائی جاتی ہے اس لئے ان میں قوتِ فیصلہ بھی باقی نہیں رہی۔ اب عوام جو کچھ کرتے ہیں اپنے اختیار و ارادہ سے نہیں کرتے بلکہ ان نعروں کے زور پر غیر شعوری طور پر قدم اٹھائے چلے جاتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر، ہماری قوم سے وہ تمام خصوصیات جن کی بنا پر انسان درجۂ حیوانیت سے بلند ہوتا ہے چھن چکی ہیں۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ قوم کی حالت کیا سے کیا ہو چکی ہے؟

عوام تو بالعموم مجبور ہوتے ہیں اس لئے ان سے چنداں شکایت نہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ملک کا لکھا پڑھا طبقہ بھی اسی رَو میں بہے چلا جا رہا ہے ان میں سے بھی نہ کوئی ارکانِ سیاست سے پوچھتا ہے کہ آپ جو اٹھتے بیٹھتے ان الفاظ کو دہراتے رہتے ہیں اور مسلسل آٹھ برس سے دہرائے چلے جا رہے ہیں ان سے آپ کا مفہوم کیا ہے؟ جب تک آپ ان کا مفہوم واضح اور متعین طور پر نہیں بتلاتے ہم انہیں سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور نہ ہی یہ لوگ علمبرداران مذہب سے اتنا پوچھتے ہیں کہ آپ غسل اور طہارت تک کے مسائل کی تو اس قدر تفاصیل بیان کرتے رہتے ہیں لیکن ان الفاظ کے آپ نے آج تک کوئی معنی متعین نہیں کئے۔ بالآخر اس مذاق سے مطلب کیا ہے۔ آپ واضح طور پر بتائیں کہ جو الفاظ آپ استعمال کر رہے ہیں ان کا مفہوم کیا ہے تاکہ ہم سوچ سمجھ کر فیصلہ کر سکیں کہ ان کی تائید کرنی چاہیئے یا نہیں۔ ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ سے صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ آپ اس روش کو اختیار کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ملی مسائل کی الجھی ہوئی گتھیاں کس طرح چند دنوں میں سلجھنی شروع ہو جاتی ہیں۔ کوئی لیڈر ہو یا مولوی۔ اخبار کا ایڈیٹر ہو یا اسمبلی کا اسپیکر، آپ اسے آگے نہ بڑھنے دیں جب تک وہ ان الفاظ کا مفہوم متعین شکل میں آپ کے سامنے پیش نہ کر دے۔ جب وہ ایسا کر دے تو پھر دیکھئے کہ وہ دوسرے وقت اس مفہوم سے پھر نہ جائے۔ نیز اس سے وقتاً فوقتاً پوچھتے رہیئے کہ اس نے اس مفہوم کو عملی پیکر میں لانے کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ یہ سب کچھ بے باکانہ کیجئے۔ گستاخانہ نہیں بلکہ بے باکانہ۔ اور دوسروں کو ایسا کرنے کی ترغیب دیجئے۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی چیز نظر آئے گی لیکن آپ دیکھیں گے کہ اس کا نتیجہ کس قدر عمدہ مرتب ہوتا ہے۔ اسی سے آپ یہ بھی دیکھ لیں گے کہ ان میں سے کتنوں کے دعاوی علم و فضل کی قلعی کھل جاتی ہے۔ جسٹس منیر نے ہمارے ان ارباب شریعت سے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ بتائیں کہ "مسلمان" کسے کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس کے جواب میں یہ لوگ کس طرح بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگ گئے تھے اور کوئی ایک بھی متعین طور پر نہیں بتا سکا تھا کہ "مسلمان" کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے۔ اسی طرح طلوع اسلام ان علمبرداران کتاب و سنت سے، برسوں سے پوچھ رہا ہے کہ "سنت" کسے کہتے ہیں اور وہ کہاں سے ملے گی۔ لیکن اس کا جواب آج تک ان میں سے کسی سے بھی بن نہیں پڑا۔ ارباب علم اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر کسی مابہ النزاع مسئلہ (PROBLEM) کو پہلے (DEFINE) کر لیا جائے۔ یعنی واضح الفاظ میں اس کا مفہوم متعین کر لیا جائے تو آدھا مسئلہ اسی طرح حل ہو جایا کرتا ہے۔ زندہ قومیں جو فکر و شعور سے کام لینا جانتی ہیں، کبھی اپنی اصطلاحات کو مبہم اور غیر متعین (UN-DEFINED) نہیں رکھتیں۔ لیکن جو قومیں فکر و عمل سے عاری ہوں، وہ ہمیشہ تجریدی گفتگو (ABSTRACT TALK) اور غیر متعین اصطلاحات میں باتیں کرتی ہیں اور ان کے لیڈر، جو خود فکر و عمل کی صلاحیتوں سے بیگانہ ہوتے ہیں انہیں مبہم الفاظ کے شاعرانہ گورکھ دھندوں میں الجھائے رکھتے ہیں۔ اس سے اُن کی بے عملی اور بے راہ روی پر پردے پڑے رہتے ہیں۔ ملتِ پاکستانیہ کو اس فریب کارانہ لفاظی کے خواب آور اثرات سے بچانے کی صورت یہی ہے کہ جو شخص اس قسم کے الفاظ استعمال کرے اس سے کہا جائے کہ وہ ان کا متعین مفہوم بیان کرے۔ قرآن نے جب کہا تھا کہ قُولُوا قَوۡلًا سَدِیۡدًا (۳۳/۷۰) تو اس کا مطلب یہی تھا۔ زندہ اقوام الفاظ کا مفہوم متعین کرتے ہیں کیا کچھ کرتی ہیں۔ اس کا اندازہ اس تازہ واقعہ سے لگائیے کہ آج کل امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں پچپن سکالرز اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بیٹھے ہیں کہ امریکہ میں انسانی مساوات (HUMAN EQUALITY) کی جو اصطلاح استعمال ہوتی ہے، اس کا متعین مفہوم کیا ہے؟ یونیورسٹی کے پروفیسروں سے لے کر گرجا کے پادریوں تک سب اس اجتماع میں شریک ہیں۔ ان کا پروگرام یہ ہے کہ وہ ایک سال تک اس مسئلہ کی تحقیق کریں کہ امریکی جمہوریت سے مقصود کیا ہے اور اس کا منتہیٰ کیا۔ "مساوات انسانی" کا سوال اس ضمن میں سب سے پہلے ان کے سامنے آیا ہے۔

یہ ہے زندہ قوموں کی حالت۔ اور دوسری طرف ہماری حالت یہ ہے کہ نہ ہمارے ارباب سیاست یہ بتا سکتے ہیں کہ "اسلامک ڈیماکریسی" کسے کہتے ہیں اور نہ ہی ارباب شریعت کو معلوم ہے کہ "مسلمان" کی "تعریف" کیا ہے اور "سنت" کا متعین مفہوم کیا؟

کیا ملک کا سوچنے والا طبقہ اس اہم اور بنیادی سوال پر غور کرے گا اور نعروں (SLOGANS) کے اس طوفان کو روکنے کی کوشش کرے گا جس میں اس وقت قوم کو بری طرح بہایا جا رہا ہے؟

کشمیر کی پکار

کراچی میں ہندوستانی ہائی کمشنر اور اقوام متحدہ کے دفاتر کے سامنے بھوک ہڑتالوں کا جو سلسلہ شروع ہو گیا ہے وہ ہلکا سا ارتعاش ہے اور اگر چالیس لاکھ مظلومین کشمیر کی آزادی جیسے عظیم الشان مسئلہ کے پس منظر میں دیکھا جائے تو اسے چنداں شائستہ اعتنا بھی نہیں سمجھا جائے گا لیکن یہ وہ بالائے سطح ارتعاش ہے جو بربنائے زیر سطح پرورش پانے والے ہیجانِ عظیم کا پتہ دیتا ہے۔ کشمیر کے بارے میں پاکستان میں جو قلبی جذبات پائے جاتے ہیں وہ محتاج تشریح نہیں۔ یہ خطہ پاکستان کا لاینفک جزو ہے۔ جس طرح اس کے بغیر پاکستان کا نام مکمل نہیں ہوتا اسی طرح اس خطے کے بغیر ہمارا ملک مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ فیصلہ تنہا جغرافیہ ہی کا نہیں بلکہ تاریخ، روایات، ثقافت، مذہب سب کا متفقہ فیصلہ ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو اور انگریز نے گہری سازش سے کشمیر کو علیحدہ کر کے پاکستان کو سر بریدہ کرنا چاہا اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان معرض وجود میں آتے ہی مجاہدین کشمیر کی مدد کو پہنچا۔ یہ مدد اتنی مؤثر ثابت ہوئی کہ ڈوگرہ حکمران سرینگر سے بھاگ کر دہلی جا پہنچا۔ کشمیر کا فیصلہ قریباً ہو چکا تھا کہ یہ مسئلہ سیاست کے گرداب میں پھنس گیا۔ بس پھر کیا تھا، جو کام ہندوستانی توپوں سے نہ ہو سکا وہ مذاکرات کی میزوں پر باتوں باتوں میں ہو گیا۔ کشمیر میں بظاہر جنگ بند ہو گئی اور امن قائم ہو گیا لیکن اس سے خطۂ جنت نظیر جہنم میں تبدیل ہو گیا۔ بیچارے کشمیری بے چارہ تر ہو گئے کیونکہ وہ دوستوں اور بھائیوں کی مدد سے محروم ہو کر ہندوستانی سنگینوں میں گھر گئے۔ وہ دن اور آج کا دن، غلامی کے شکنجے کستے ہی جا رہے ہیں۔ کشمیر کم و

بٹیں ہندوستان کا حصہ بنا دیا گیا ہے اور اس کی آزادی خواہ مسلم آبادی کو اقلیت میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ غیر تو غیر خود ریاستی باشندوں کو مجالِ احتجاج نہیں کیونکہ بات پر دار پر زبان کٹتی ہے۔ اور تو اور شیخ عبداللہ جیسا مرید با صفا جس نے کشمیر کی قسمت کو پوری طرح ہندوستان سے وابستہ کر دیا تھا وہ بھی اس کے خلاف لب کشائی کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور پنڈت نہرو کے جنون کا یہ عالم ہو گیا کہ عبداللہ کو اس جرم کی پاداش میں نہ محض معزول کر دیا بلکہ غیر معین عرصہ کے لئے جیل میں ٹھونس دیا۔ لیکن آزادی کا جذبہ جبر و تشدد سے دبتا نہیں اور ابھرتا ہے۔ مسلمان تو مسلمان خود ہندوؤں میں جذبات غیض و غضب پرورش پانے شروع ہو گئے۔ اس میں پیش پیش پنڈت پریم ناتھ بزاز اور ان کے رفقا ہیں۔ وہ مسلسل ہندوستان کے جور و تعدی کے خلاف احتجاج کرتے چلے آ رہے ہیں اور یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ کشمیر کو آزاد استصواب کے ذریعہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس جرم کی پاداش میں پہلے انہیں جیل میں جھونک دیا گیا پھر ریاست بدر کر دیا گیا۔ اس کے باوجود پنڈت بزاز کا جذبۂ آزادی دب نہ سکا۔ وہ دہلی میں مقیم ہو کر اپنے مطالبہ کے حق میں فضا سازگار کرتے رہے۔ ہندوستان آزادی کی اس آواز کو کیسے برداشت کر سکتا تھا؟ چنانچہ اس آواز کو بھی بند کر دیا گیا ہے اور پنڈت بزاز کو پھر سے سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بند کر دیا گیا ہے۔

ان **واقعات** سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے عزائم کیا تھے۔ گو ان عزائم میں کبھی شبہ نہیں تھا لیکن ان کے ہوتے ہوئے کسی ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہمیں یہ کہنا اس لئے پڑتا ہے کہ ہماری حکومت اس غلط فہمی میں شکار چلی آ رہی ہے کہ وہ ہندوستان سے معقول بات منوا لے گی۔ اس غلط فہمی کا خصوصی مظاہرہ گذشتہ دو سال سے مسلسل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ سابق وزیر اعظم محمد علی صاحب نے اس سلسلہ میں بڑا افسوسناک مظاہرہ کیا اور ہندوستان کو اور مہلت مہیا کر دی کہ وہ اپنے آہنی پنجے زیادہ مضبوطی سے گاڑ لے۔ جب سے وہ حکومت سے علیحدہ ہوئے ہیں نئی حکومت کو کشمیر کے بارے میں اپنی حکمت عملی متعین کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ایک تو اندرونی سیاست نے ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ ان مسائل مہمہ کی طرف پوری طرح توجہ نہیں دی جا سکتی۔ دوسرے آل پارٹیز کانفرنس بلانے کا جو فیصلہ کیا گیا ہے اس سے مزید تاخیر واقع ہو گئی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ ایسا ہے کہ اس کے متعلق ہر پاکستانی صرف ایک ہی رائے رکھتا ہے اور وہ یہ کہ کشمیر کو ہندوستان کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرایا جائے۔ اس لئے اس سلسلے میں کسی صلاح و مشورے کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن اگر اس کی ضرورت سمجھی جاتی ہے تو حکومت کو چاہیئے تھا کہ اس کا فی الفور انتظام کرتی اور ایک متعین لائحہ عمل طے کر کے عمل پیرا ہو جاتی کیونکہ ایک دن کی تاخیر بھی کشمیر اور پاکستان دونوں کے لئے انتہائی ناگوار نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ حکومت کی اس گو مگو اور لیت و لعل کا نتیجہ ہے کہ قوم میں بے صبری پیدا ہو گئی ہے اور ایسے افراد ابھرنا شروع ہو گئے ہیں جو اپنی بساط کے مطابق کشمیر کے لئے کچھ کر گزرنا چاہتے ہیں۔ ان کی قربانی کا جو بھی نتیجہ نکلے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کشمیر کے لئے اپنی جانیں نثار کرنے کے لئے تیار ہیں۔ انہیں اس سے سروکار نہیں کہ ان کی جان جہانگیر روڈ پر جان آفریں کے سپرد ہوتی ہے یا بندر روڈ پر۔ انہیں موقع ملے تو وہ کشمیر کے لالہ زاروں کو اپنے خون گرم کی رنگینی سے شرمانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ لیکن یہ موقع بہم پہنچانا حکومت کا کام ہے۔ اور حکومت ابھی اپنے مصالح کو دیکھ رہی ہے۔ حکومت کی خوش قسمتی ہے کہ اتنے نازک معاملہ میں بھی قوم نے اس کا ساتھ دیا ہے اور کوئی اضطراری اور عاجلانہ حرکت نہیں کی۔ اب بھی قوم کا دبا ہوا طوفان اُسی عزم و احتیاط سے چھوٹ رہا ہے۔ لیکن یہ قرائن ایسے ہیں جن سے حکومت کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ اس نے کم سے کم وقت میں کشمیری پالیسی متعین کر کے قیادت کا فرض ادا نہ کیا تو معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ وہ ہندوستان اور اقوام متحدہ کا منہ دیکھ سکتی ہے۔ قوم میں اتنا صبر نہیں۔ انہیں مظلومین کشمیر کی آہیں اور کراہیں پکار رہی ہیں۔ وہ بقول اقبال: ولر کے کنارے خضر کی طرح سوچتی نہیں رہ سکتی کہ

جہاں کے چشمے ابلتے ہیں کب تک

اس کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے اور اب مقام آ پہنچا ہے جہاں موت زندگی سے بھی زندہ تر ہو جاتی ہے! ان آثار حیات کو غیر وقیع سمجھنے والے جان لیں کہ

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

معاہدہ بغداد

پاکستان بالآخر معاہدہ بغداد میں شریک ہو گیا ہے یہ معاہدہ اسی سال ۲۴ فروری کو ترکی اور عراق میں طے پایا تھا۔ اور اس سلسلہ کی دوسری کڑی تھا۔ جس کی ابتداء گذشتہ ترکی پاکستانی معاہدہ سے ہوئی تھی۔ ترکی اور پاکستان کا معاہدہ بھی انہی خطوط پر تھا۔ اور اس میں بھی دیگر ممالک کے شریک ہونے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ لیکن عربوں کی سیاست سے ایسی صورت حال پیدا ہوئی کہ عراق کو اس معاہدہ میں شریک کرنے کی بجائے ترکی نے اس سے علیحدہ معاہدہ کر لیا۔ اور پھر کوشش شروع ہوئی کہ پاکستان کو اس میں شریک کیا جائے۔ پاکستان کی شرکت یوں تو یقینی تھی کیونکہ دونوں معاہدے ہم مقصد تھے اور شروع ہی سے پیش نہاد مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم کی تشکیل تھا۔ لیکن اس کا رسمی اعلان کئی ماہ سے ٹلتا چلا آ رہا تھا۔ بارے انتظار کا یہ صبر آزما سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اور معاہدہ بغداد اب یقینی مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔

پاکستان کے آنے سے معاہدہ بغداد چار قومی ہو جاتا ہے تیسری معاہد قوم برطانیہ ہے۔ ضمناً یہ برطانیہ کی شرکت کا نتیجہ تھا کہ سنہ ۱۹۳۲ء کا برطانوی عراقی معاہدہ — جس کی رو سے برطانیہ نے عراق میں دو فوجی اڈے قائم کر رکھے تھے بدل گیا اور عراق پوری طرح آزاد ہو گیا۔ اب جب چار قومیں معاہد ہو گئی ہیں تو معاہدے کی شق چھ کے مطابق چاروں کے وزراء کی ایک مستقل کونسل معرض وجود میں آئے گی جو معاہدہ کو عملی شکل دے گی گویا معاہدہ بغداد پر عملدرآمد پاکستان کی شرکت سے ممکن ہوا ہے۔ اس سے پاکستان کی شرکت کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس معاہدے کا مقصد دنیا میں بالعموم اور مشرق وسطیٰ میں بالخصوص امن کا قیام اور تحفظ ہے۔ مشرق وسطیٰ عالمی سیاست میں بڑا اہم مقام ہے۔ یوں تو یہ علاقہ تاریخ میں ہمیشہ خصوصی اہمیت کا مالک رہا ہے۔ اور آدمیوں اور خیالات میں تصادم کا میدان بنا رہا ہے۔ لیکن موجودہ مشرق و مغرب کی کشمکش میں اس کی اہمیت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ سیاسی اعتبار سے یہ علاقہ مغرب کے تغلب میں رہا اور اب کچھ اس تعلق کی بنا پر اور کچھ سیاسی وجوہ کی بنا پر اس کا میلان مغرب کی طرف ہے۔ روس کی للچائی ہوئی نگاہیں اشتراکی انقلاب سے پہلے بھی ان علاقوں پر پڑتی تھیں۔ اور اب تو اسے اور زیادہ ضرورت ہے کہ وہ یہاں اثر و نفوذ پیدا کرے۔ اس کے لئے اسے ضروری ہے کہ ایک مغربی اثر کو زائل کرے اور دوسرے مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان اشتراکیت سے جو عدم لگاؤ ہے۔ اس کا تدارک کرے۔ پہلا مقصد حاصل کرنے کے لئے اس نے غیر جانبداری کا تصور پیدا کیا۔ غیر جانبداری کا تصور اس کے نزدیک اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ علاقے مغرب سے اپنا رشتہ منقطع کر لیں۔ اسے یقین ہے کہ مغرب بے دخل ہو گیا۔ تو اس خلاء کو وہی پُر کرے گا۔ جہاں تک اسلام اور اشتراکیت کے تصادم کا تعلق ہے۔ اس پر وہ بقاء باہم کے پردے ڈال رہا ہے۔ ان عوامل نے مشرق وسطیٰ کو ایک دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے۔ وہ طویل غفلت کے بعد بیدار ہو رہا ہے۔ نئی حاصل شدہ سیاسی آزادی نے ان ممالک کے سامنے چند در چند مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ ان میں نمایاں معاشی بدحالی اور عسکری کمزوری ہے۔ ان دونوں کے ارتفاع کے لئے تجربے اور سرمائے کی ضرورت ہے جو مغرب بالخصوص امریکہ سے میسر آ سکتے ہیں۔ روس اور ہندوستان اس میں مزاحم ہو رہے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کو امریکہ جیسا طاقتور حلیف مل گیا۔ تو ان کی قیادت کا خواب پریشان ہو جائے گا۔ ان ممالک کی نفسیات غلامی کے صدقے میں ان کوششوں کا کچھ اثر ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے مشرق وسطیٰ یا بالفاظ دیگر دنیائے اسلام کے سامنے دو صورتیں آ گئی ہیں۔ ایک امریکہ سے اتحاد۔ بین الاقوامی سیاست میں اتحاد کے بغیر گذارہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک کمزور قوم کا بے یار و مددگار رہنا تو ایک طرف امریکہ اور روس جیسے ممالک دوستوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ان کی سیاست کا نقطہ ماسکہ یہ ہو گیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ حلیف بنائیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو امریکہ اور روس میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہو گا۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو عالمی قوتیں انھیں زبردستی ادھر سے اُدھر لے جائیں گی۔ امریکہ کا انتخاب اس لئے قابل ترجیح ہے کہ اس سے انھیں مطلوبہ معاشی اور فوجی مدد مل سکتی ہے۔ اور اگر مسلمان متحد ہو کر اس سے معاملہ طے کریں تو وہ سیاسی غلامی کے باقیات کو ختم

کرا سکتے ہیں اور آبرومندانہ سودا کر سکتے ہیں۔ جس میں لین بھی ہوگا اور دین بھی۔ چونکہ امریکہ کو مسلمانوں اور اس کے علاقوں کی ضرورت ہے۔ اس لئے وہ اس کی قیمت ضرور دے گا۔ اس قیمت کا تعین ہمارے اتحاد کے ہاتھوں ہوگا۔ دوسری صورت روس سے اتحاد ہے اس اتحاد میں مسلمانوں کا کوئی بھلا نہیں۔ اول تو اس لئے کہ مسلمان ممالک کے بیشتر مسائل اقوام مغرب سے متعلق ہیں۔ اور وہ انہی سے براہِ راست طے ہو سکتے ہیں۔ دوسرے روس مطلوبہ معاشی امداد نہیں دے سکتا۔ بلکہ دوسرے ممالک کو مدد دیکر ان کا معاشی درجہ بلند کرنا ان کے فلسفۂ اشتراکیت کے خلاف ہے۔ معاشی ابتری کا پھیلنا اس کے نزدیک اشتراکیت کا ناگزیر پیش خیمہ ہے۔ تیسرے ———— دوسری شق کا لازمی نتیجہ ہے۔ روس سے تعلقات کی استواری میں اشتراکیت کو لامحالہ فروغ ملیگا۔ اور یہ فروغ محض نظریاتی فروغ نہیں ہوگا بلکہ تجربہ شاہد ہے کہ یہ روسی (اشتراکی) استعماریت ہوگی۔

یہ ہے وہ دوراہا جہاں دنیائے اسلام کھڑی ہے گو راہ انتخاب واضح ہے۔ لیکن چونکہ دونوں طرف عالمی قوی مصروف کار ہیں۔ اس لئے کمزور و متفرق اقوام مسلم کوئی فیصلہ نہیں کر پاتیں اور فیصلہ نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ وہیں کی وہیں کھڑی ہیں۔ آج کی تند و تیز آندھیوں میں یہ صریحاً ناممکن ہے۔ وہ طوفانوں کے رحم و کرم پر ہیں اور ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر ناتوان تنکوں کی طرح اڑ رہی ہیں۔ ان طوفانوں میں انقرہ اور کراچی نے سلامتی کا مینار تعمیر کیا۔ اور پھر دونوں نے مل کر ممالک مسلمہ کی ننھی ننھی کشتیوں کو بچانے کی سر توڑ کوشش کی۔ اللہ کا شکر ہے کہ عراق کو بچا لیا گیا، ایران کے بچ نکلنے کی توقع ہے۔ بعض ممالک مثلاً مصر ابن نوح کے الفاظ میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ غیر جانبداری کا پہاڑ انھیں اس سیلاب عظیم سے بچا لے گا۔ وہ اس کی ہلاکت سامانیوں سے بے خبر ہیں اور ان آسردں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں جن کی حیثیت تنکوں سے زیادہ وقیع نہیں۔ جہاں ان کی بہت سی وجوہ ہیں (ان پر طلوع اسلام میں کئی مرتبہ گفتگو کی جا چکی ہے) وہاں ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں یا ان کو سمجھایا جاتا ہے کہ معاہدہ بغداد ان کے بچاؤ کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ بادی النظر میں یہ صحیح ہے۔ پاکستان، ترکی اور عراق مل کر بھی ان طوفانوں کے حریف نہیں ہو سکتے جو شرق وسطیٰ میں چلنا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ ابتداء واقعی حقیر ہے لیکن اس کی ممکنات بے پایاں ہیں۔ جیسا کہ پہلے کئی مرتبہ لکھا گیا ہے اور اوپر بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں وحدت عالم اسلامی کی صورت مضمر ہے۔ جو دور رس نتائج کی حامل ہے مصر ٹھنڈے دل سے غور کرے تو اسے یقین ہو جائے گا کہ اس کی ہی نہیں بلکہ عالم اسلامی کی نجات معاہدہ بغداد میں ہے ان ممکنات کے پیش نظر ترکی، عراق اور پاکستان کی ذمہ داری بڑی نازک ہو جاتی ہے۔ انھیں عمل سے یہ دکھانا ہوگا کہ معاہدہ بغداد ایک طاقتور محاذ ہے اور یہ مسلمانوں کو متحد اور مستحکم بنانے کا موجب ہے۔ انھیں ہوشیاری اور تدبر سے کام لے کر اس خاکے میں رنگ محل

بھرتے جانا چاہیئے۔ اور برادران اسلام پر کلام نرم و نازک سے یہ واضح کرتے رہنا چاہیئے کہ ان کا بھلا اسی میں شریک ہونے سے ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مصر کی مخالفت حقائق کی تادیر حریف نہیں ہو سکیگی۔ اس معاہدہ میں شریک ہو کر پاکستان کی ذمہ داری نازک تر ہو گئی ہے۔ وہ جنوب مشرق ایشیا میں سیٹو میں بھی شامل ہے۔ ان دونوں معاہدوں کو ملا کر دیکھا جائے تو پاکستان امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا تھائی لینڈ، فلپائن، نیوزی لینڈ، ترکی اور عراق یعنی کل آٹھ ممالک کا حلیف بن گیا ہے۔ اس طرح اس کی ذمہ داریوں کا دائرہ قسطنطنیہ سے منیلا تک وسیع ہو جاتا ہے۔ ذمہ داریوں کا اضافہ عالمی سیاست میں پاکستان کے مقام و منصب کا بھی پتہ دیتا ہے اور اس کا بھی ثبوت ہے کہ دنیا میں پاکستان کے دوستوں میں اضافہ ہو رہا ہے جس ملک کے اتنے دوست ہوں وہ دنیا میں سر اونچا کر کے چل سکتا ہے۔ لیکن سر اونچا کرنے کے لئے جس قامت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ پاکستان کو حاصل نہیں ہوا۔ اس کی وجہ اندرون ملک تلاش کرنی چاہیئے۔ جب تک پاکستان اندرونی استحکام نہیں کرے گا۔ اور ان دھندوں سے فارغ نہیں ہو جائیگا جو اس کی ملی قوت کو ضائع کرنے کا موجب بن رہے ہیں اس وقت تک وہ بیرون ملک نہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیگا نہ اس قامت کو بلند کر سکے گا جو ان بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کا لازمہ ہے۔ لیکن یہ علیحدہ مبحث ہے۔ جس پر کئی بار گفتگو کی گئی ہے اور کی جاتی رہے گی۔

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے
پرانے پرچے

ماہنامہ طلوع اسلام کے جو پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۹۴۹ء	اگست۔ ستمبر۔ نومبر۔ دسمبر
۱۹۵۱ء	جون ستمبر، اکتوبر، نومبر
۱۹۵۲ء	اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری و اکتوبر کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے بزمہائے طلوع اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیدیئے جائیں گے۔ خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں۔ ورنہ ختم ہو جانے کا احتمال ہے۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کراچی

قرآنی انقلاب کا لٹریچر

معراجِ انسانیت (از پرویز) سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد معہ گرد پوش۔ قیمت پندرہ روپے

ابلیس و آدم (از پرویز) سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصۂ آدم، جنات ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۰۷ صفحات ———— قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ دو سو چوبیس صفحات ———— قیمت: دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام (از پرویز) نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا شگفتہ مدلل اور اچھوتا جواب بڑے سائز کے ۴۴۴ صفحات ———— قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے روز مرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث ۴۰۰ صفحات ———— قیمت چار روپے

اسبابِ زوالِ امت (از پرویز) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ایک سو اڑتالیس صفحات ———— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر ساتھ سالہ دور آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ ۲۰۸ صفحات ———— قیمت دو روپے آٹھ آنے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:۔ ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ کراچی

تاریخی شواہد

(۳۲)

یہ ایک ایسا واضح اور کھلا ہوا اعتراض تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا! انسان اور اپنے ہاتھوں کی تراشیدہ مورتیوں کے سامنے جھکے! یہ ایک ایسی واضح گمراہی ہے جس کے جواز میں ایک لفظ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ الّا اس کے کہ :-

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِیْنَ ۝ (۲۱/۵۳)

تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو دیکھا وہ ان ہی کی پوجا کرتے تھے۔

لیکن اس مضحکہ انگیز دلیل کی حقیقت کیا ہے؟

قَالَ لَقَدْ کُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (۲۱/۵۴)

ابراہیم نے کہا۔ یقین کرو۔ تم خود بھی اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں تھے۔

لیکن قوم کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یہ نوجوان سچ مچ اپنے اسلاف کی روش کہن کے خلاف ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِیْنَ ۝ (۲۱/۵۵)

اس پر انہوں نے کہا تو ہم سے سچ مچ کہہ رہا ہے یا یونہی مزاح کر رہا ہے

آپ نے کہا کہ اس میں مزاح کی کون سی بات ہے! یہ ایک حقیقت ہے جس پر کامل متانت اور سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے

قَالَ بَلْ رَّبُّکُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۝ (۲۱/۵۶)

ابراہیم نے کہا۔ مذاق نہیں۔ میں سچ مچ تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس خدا کا قانون ربوبیت کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جاری و ساری ہے اس کا قانون تمہارے معاشرہ میں بھی نافذ ہونا چاہیئے میں اس حقیقت کی شہادت پیش کر رہا ہوں

بت پرستی کی تائید میں جو دلیل قوم کی طرف سے پیش کی گئی تھی وہ تو ہمارے سامنے آچکی ہے اس مسلک کے ابطال میں حضرت ابراہیم نے جو کچھ فرمایا وہ قابلِ غور ہے۔ سورہ شعراء میں ہے :

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰکِفِیْنَ ۝ قَالَ هَلْ یَسْمَعُوْنَکُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۝ اَوْ یَنْفَعُوْنَکُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ ۝ (۲۶/۶۹—۷۳)

اور (اے پیغمبرِ اسلام) ابراہیم کے حالات (سے متعلق آیات کو) اُن کے سامنے پڑھو، جب اس نے اپنے والد اور اپنی قوم سے (متحیر ہو کر) کہا کہ "آخر یہ تم کن کی عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا۔ "ہم (اپنے بزرگوں اور محترم و معظم چیزوں کی اطاعت کر رہے ہیں جن کی) مورتیوں کو پوجتے ہیں۔ چنانچہ ان کی پوجا میں جمے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس پر ابراہیم نے کہا "کیا وہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انہیں پکارتے ہو یا تمہیں نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں (کیونکہ اس کے بغیر تو کوئی چیز بھی اطاعت کے لائق نہیں ہو سکتی)

اس سوال کا جواب کیا تھا؟ اسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت۔

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا کَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ ۝ (۲۶/۷۴)

وہ بولے (نہیں، یہ بات تو نہیں ہے) بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اس کے جواب میں حضرت ابراہیم نے پھر یہی فرمایا کہ اس بات کو چھوڑو کہ یہ مسلک تمہارے اسلاف سے متوارث تم تک پہنچا ہے۔ سوچو یہ کہ یہ مسلک ہے کیسا؟ اسلاف پرستی کے خلاف کیسی بصیرت افروز دلیل ہے یعنی نفس شے پر غور کرو اور سوچو کہ اس کی حقیقت کیا ہے کوئی روش محض اس لئے صحیح نہیں قرار پا سکتی کہ وہ چند نسلوں سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ فرمایا

قَالَ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا کُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝ (۲۶/۷۵—۷۶)

ابراہیم نے کہا "ظالمو! تم نے غور بھی کیا کہ تم اور تمہارے اگلے باپ دادا کن لوگوں کی عبودیت (اطاعت شعاری و فرماں پذیری) اختیار کرتے چلے آرہے ہو؟

اس مقام پر آپ نے غیر اللہ کی عبودیت کے متعلق یہ فرمایا کہ دیکھو! ان میں سے کسی میں یہ قوت نہیں کہ تمہیں کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچا سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی لغزش کی سب سے خطرناک گھاٹی جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کا خیال ہے۔ ایک انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے جھکتا اس وقت ہے جب وہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ شخص اسے کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ مظاہرِ فطرت (آگ، پانی، بادل، بجلی، شیر، سانپ) کی پرستش، یا ان دیوی دیوتاؤں کی تماثیل (مٹی اور پتھر کے بتوں) کی پوجا کی ابتدا بھی اسی جذبہ کے ماتحت ہوئی اور اس سے آگے بڑھ کر انسانوں کی محکومیت و عبودیت کی بنیادیں بھی انہی تصورات پر استوار ہوئیں۔ ایک داعیِ توحید، قلب و دماغ کے بُت خانوں کی انہی بنیادوں کو اکھیڑتا ہے۔ جب وہ اس حقیقت باہرہ کو سامنے لاتا ہے کہ دنیا میں نفع و مضرت کی قوت خدا کے قانونِ مشیت کے علاوہ اور کسی کی نہیں۔ سورہ عنکبوت میں ہے :

وَاِبْرٰهِیْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ۭ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْکًا ۭ اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْکُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ وَاِنْ تُکَذِّبُوْا فَقَدْ کَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِکُمْ ۭ وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝ (۲۹/۱۶—۱۸)

(اور اے پیغمبر! اسی طرح) ہم نے ابراہیم کو پیغمبر بنا کر بھیجا، (یاد کرو) جب اس نے اپنی قوم سے کہا۔ اللہ ہی کی عبودیت (اطاعت و حکومت پذیری) اختیار کرو۔ اور اس کے قوانین کی نگہداشت کرو۔ اگر تم جانو، تو یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ تم لوگ خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے ہو اور (اس طرح) ایک (سفید) جھوٹ گھڑتے ہو۔ خدا کو چھوڑ کر جن لوگوں کی تم عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کرتے ہو، وہ یقیناً تمہارے واسطے روزی کے مالک نہیں۔ رزق خدا کے قانون کے مطابق طلب کرو اُسی کی عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کرو۔ اور اُس کی عطا کردہ نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ تمہارا ہر قدم اُسی کی طرف اٹھ رہا ہے (یہی سچائی اور صداقت ہے)۔ لیکن اگر تم اسے جھٹلاتے ہو (تو یہ کوئی نئی بات نہیں) تم سے پہلے اور اُمتیں بھی (سچائی کے علمبرداروں کو) جھٹلا چکی ہیں۔ رسول (اور پیغامبر) کے ذمہ تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ واضح طور پر (خدا کے ارشادات پہنچا دے اور بس!)

جلبِ منفعت کے دائرہ میں رزق کو بڑی ممتاز حیثیت حاصل ہے (رزق کے خزانوں کی کنجیاں کس طرح خدائے واحد کے اپنے ہاتھوں میں ہیں، اس کی تفصیل "نظام ربوبیت" میں ملے گی)

ابلیس و آدم
(از پرویز)
قیمت:- آٹھ روپے

اسلام کی سرگزشت

باب دوم — اسلام — پہلی فصل

گذشتہ اشاعتوں میں زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی حیات عقلیہ سے بحث کی جا چکی ہے اور اس کے مظاہر یعنی لغت، زبان، شعر و شاعری، ضرب الامثال اور قصوں کہانیوں وغیرہ سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ حالیہ صحبت میں یہ بتایا جائے گا کہ اسلام نے عربوں کی حیات عقلیہ پر کیا اثرات مرتب کئے تھے۔

جاہلیت اور اسلام کے درمیان

عربوں کی عقلیت پر دو مختلف جہتوں سے اسلام نے دو بڑے اثرات مرتب کئے جن میں سے ایک اثر تو ڈائرکٹ تھا یعنی ان تعلیمات کا اثر جو عربوں کے عقائد کے برخلاف اسلام لایا تھا۔ دوسرا اثر ان ڈائرکٹ تھا یعنی اسلام نے عربوں کو ایران اور سلطنت روم کو فتح کرنے کا اہل بنا دیا۔ یہ دونوں عظیم قومیں اس عہد میں زیادہ ترقی پذیر مدنیت کی حامل تھیں۔ ان فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفتوحہ شہر اور ان کا انتظام اور علم و فلسفہ عربوں کی نظروں میں آیا اور غیر محسوس طور پر ان کی یہ تمام چیزیں مسلمانوں میں سرایت کرتی چلی گئیں جس سے ان کی عقلیت بھی متاثر ہوئی۔ ہم آگے چل کر ان دونوں اثرات کے متعلق تفصیل بیان کریں گے۔

لفظ اسلام اور اس کے معنی

(س - ل - م) مادہ کو لے کر لفظ اسلام کی تحقیق کی جستجو کریں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ سَلَامٌ کے معنی سلامتی کے ہوتے ہیں جو جنگ اور مخاصمت کی ضد ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔ (خدا کے فرمانبردار بندے وہ ہیں جو زمین پر نرمی سے چلتے ہیں اور جب لوگ انہیں مخاطب کرتے ہیں تو وہ سلام کہتے ہیں) شاید یہ آیت اُس کلید ہے جس سے ہم اس وجہ تک پہنچ سکتے ہیں جس کی بنا پر محمد صلعم کی بعثت سے پہلے زمانہ کو جاہلیت اور رسول اللہ کے زمانہ کو اسلام کا لقب دیا گیا۔ جاہلیت کا لفظ اس جَهْلٌ سے ماخوذ نہیں ہے جو علم کی ضد ہوتا ہے بلکہ یہ جَهْلٌ سے مشتق ہے جس کے معنی بیوقوفی، غصہ اور عصبیت کے ہوتے ہیں؟ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ابوذر غفاریؓ کو جبکہ انہوں نے ایک آدمی کو اس کی ماں کا نام لے کر عار دلائی تھی۔ فرمایا تھا: "تم ایک ایسے آدمی ہو جس میں جاہلیت ہے۔" مطلب یہ تھا کہ تمہارے اندر جاہلیت کی روح موجود ہے اس معنی سے قریب یہ بھی ہے کہ وہ: "سَتَجْهَلُهُ الشَّيْئُ" کو اسے اس چیز نے بہت ہی ہلکا تصور کیا کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ کسی شاعر کا یہ مصرعہ ہے۔

وَقَالَ الْهَوٰى وَاسْتَجْهَلَتْكَ الْمَنَازِلُ

(منزلوں نے تو تمہیں کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ کوئی قدر کی البتہ محبت ہی نے تمہاری حفاظت کی)

عمرو بن کلثوم کے معلقہ میں یہ شعر موجود ہے۔

اَلَا لَا يَجْهَلَنْ اَحَدٌ عَلَيْنَا
فَنَجْهَلَ فَوْقَ جَهْلِ الْجَاهِلِيْنَا

(یاد رہے، کوئی آدمی ہمارے خلاف جہالت کا مظاہرہ نہ کرے۔ پھر جاہلوں سے بڑھ کر جہالت کا مظاہرہ کریں گے۔)

ان تمام استعمالات سے نظر آتا ہے کہ جاہلیت کے لفظ سے مراد ہلکا پن، تعصب، حمیت اور مفاخرت وغیرہ خصائص ہیں جو اسلام سے پہلے عربوں کی زندگی کے نمایاں ترین عناصر تھے اسی بنا پر اس عہد کو جاہلیت کہا جاتا تھا۔ ان کے بالمقابل انکسار نفس، تواضع، نیک عملی کی قدر و قیمت، نسبی غرور کی بے اعتباری، یہ تمام اثرات سلامتی اور مصالحت کے ہوتے تھے۔ لہٰذا طبریؒ کے بیان کے مطابق آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ کے فرمانبردار بندے وہ ہیں جو زمین پر حلم اور بردباری کے ساتھ چلتے ہیں اور جو لوگ ان کے خلاف جہالت کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ ان کے خلاف جہالت کا مظاہرہ نہیں کرتے۔

پھر یہ لفظ ایک دوسرے معنوں کی طرف منتقل ہوا۔ جو اس سے قریب تھا اور لفظ اَسْلَمَ کا استعمال ہونے لگا جو سَلَامٌ ہی سے نکلا تھا۔ اس کے معنی خضوع اور انقیاد و اطاعت کے ہوتے تھے۔ کیونکہ خضوع و انقیاد ہی ایسی چیزیں ہیں جو سلامت و مصالحت کی طرف اور چیزوں سے زیادہ داعی ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ذیل کی آیات میں انہی معنوں میں یہ لفظ آیا ہے: وَاَنِيْبُوْا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ" اور فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ علاوہ ازیں قرآن میں یہ لفظ بعض جگہ مومن اور کافر سب لوگوں پر بول دیا گیا ہے۔ کیونکہ سب خدا کے کائناتی قوانین کے سامنے عاجز اور پیدائشی طور پر مطیع و منقاد ہیں، خوشی سے ہوں یا ناخوشی سے۔ دنیا کے کائناتی قوانین ان پر برابر نافذ ہوتے رہتے ہیں اور ان میں ان سے باہر نکلنے کی ذرا قدرت نہیں ہوتی۔

وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ

(پستیوں اور بلندیوں میں جس قدر مخلوقات ہے وہ بخوشی اور جبراً اس کے قوانین کی فرمانبردار ہے اور سب اس کے قوانین کے گرد گھوم رہے ہیں)

تو پستیوں اور بلندیوں کی تمام چیزیں اس معنی میں مُسْلِمٌ ہیں یعنی خدا کے قوانین کی مطیع ہیں اور دنیا میں جو قوانین اس نے مقرر کر دیئے ہیں ان کے فرمانبردار ہیں۔

بعد میں یہ لفظ صرف ان لوگوں پر بولا جانے لگا جو بخوشی اپنے آپ کو خدا کا مطیع و فرمانبردار بنا لیں۔ گویا مُسْلِمٌ وہ ہوا جو بخوشی خدا کی اطاعت کرے۔ اور اس طرح طبعی اور ارادی دونوں اطاعتیں اس میں جمع ہو جائیں۔ قرآن کریم کی یہ آیت اس مضمون سے قریب ہے جہاں فرمایا۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ، ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

(تمام نظام ہائے حیات سے منہ موڑ کر اسلامی نظام کے لئے اپنے آپ کو ہموار کرو۔ یہی خدا کی وہ فطرت ہے جس کے مطابق اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کے قانون تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی استوار نظام زندگی ہے لیکن اکثر لوگ اس پر یقین نہیں رکھتے)

اس معنے میں مُسْلِمٌ کا لفظ ہر اس شخص پر بول دیا جاتا ہے جو خدا کے قوانین کے سامنے سرافگندہ ہو اور انبیائے کرام میں سے کسی نبی کی پیروی کرتا ہو۔ چنانچہ ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد صلعم کے تمام پیروکار مُسْلِمٌ کہلاتے ہیں۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّىْۤ اُلْقِىَ اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ، اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَىَّ وَاْتُوْنِىْ مُسْلِمِيْنَ

(ملکۂ سبا نے کہا۔ "سرداران قوم! میرے پاس ایک معزز مکتوب آیا ہے جو سلیمان کی طرف سے ہے اور اللہ کے نام سے شروع ہوتا ہے جو رحمٰن و رحیم ہے اور اس میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ میرے خلاف سرکشی نہ کرو اور (مُسْلِمٌ) مطیع و فرمانبردار بن کر آ جاؤ۔")

وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ، يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○

(ابراہیم نے اپنی اولاد کو اور یعقوب نے اپنی اولاد کو یہ وصیت کی تھی کہ خدا نے تمہارے لئے اس نظام زندگی کو منتخب فرمایا ہے لہٰذا تم اس حال میں مرنا کہ اس کے (مُسْلِمٌ) مطیع و فرماں بردار رہو)

سورۂ یوسف میں ہے

تَوَفَّنِىْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِىْ بِالصّٰلِحِيْنَ

(خدایا مجھے (مُسْلِمٌ) مطیع و فرمانبردار بنا کر مارنا۔ اور نیکوکار لوگوں کے ساتھ ملا دینا۔)

اسلامی معاشرت
قیمت دو روپے

مجلس اقبال
مثنوی اسرارِ خودی
باب دوم (مسلسل)

باطلِ دیرینہ را غارت گرے
فتنہ در جیبے سراپا محشرے

اس میں اتنی قوت ہونی چاہیئے کہ وہ کائنات سے ہر کہنہ باطل کو مٹا کر رکھ دے۔ اس کی رگوں میں انقلاب آفریں بجلیاں بھری ہونی چاہئیں۔ وہ انسانی دنیا کے ذرہ ذرہ میں انقلاب پیدا کردے اور مردہ قوم کو حیاتِ نو عطا کر کے حرکت اور حرارت کا ایک حشر برپا کردے۔ مقصد اور آرزو کی اس تشریح کے بعد وہ اپنی ملت شریفہ سے کہتے ہیں۔

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

ہماری زندگی تخلیقِ مقاصد سے ہے۔ اگر ہم کسی مقصد کو اپنے سامنے نہیں رکھتے اور نئے نئے مقاصد کو پیدا نہیں کرتے تو ہم زندہ نہیں ہیں۔ یہ تو ہے ہماری زندگی کا راز۔ یعنی تخلیقِ مقاصد۔ باقی رہا اس زندگی میں درخشندگی اور تابندگی کا پیدا ہونا، تو وہ شعاعِ آرزو کے صدقے میں ملتی ہے۔ مختصراً یہ کہ اس آب و گل کے پیکر میں زندگی کی نمود تخلیقِ مقاصد سے ہوتی ہے۔ اور پھر اس زندگی میں حرارت اور نورانیت اس مقصد کے حصول کی تڑپ سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کو آرزو کہتے ہیں۔

اس شعر پر دوسرا باب ختم ہو جاتا ہے۔

مجلسِ اقبال
تیسرا باب

در بیان ایں کہ خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد

سابقہ باب میں اقبال نے یہ بتایا تھا کہ خودی کا استحکام اور بقا اس سے ہے کہ انسان کے سامنے ایک متعین نصب العین ہو اور اس نصب العین کے حصول کی تڑپ اس کے دل کے اندر موجزن رہے۔ زیرِ نظر باب میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ خودی کے استحکام کا دوسرا عنصر عشق اور محبت ہے۔ اقبال کی دیگر اصطلاحات کی طرح "عشق" کی اصطلاح بھی اپنا خاص مفہوم رکھتی ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے عشق کا لفظ ہمارے ہاں بہت بلند ہو گیا ہے حالانکہ اس سے پہلے ہمارے معاشرہ میں کیفیت یہ تھی کہ شریف گھرانوں میں یہ لفظ بولا تک نہیں جاتا تھا اور کسی شریف نوجوان لڑکی کی زبان تک اس لفظ کا آجانا قیامت برپا کر دیتا تھا۔ اقبال نے ان الفاظ کو جو نئے معنی پہنا دیئے اس کی وجہ سے اب یہ ہماری مجلسوں اور گھروں میں عام استعمال ہوتے ہیں، اور صرف استعمال ہی نہیں ہوتے بلکہ ان سے دلوں کے اندر تازہ ولولے، آنکھوں میں چمک اور دماغوں میں جلا پیدا ہوتی ہے۔ ادب کے اندر اتنا عظیم انقلاب شاید ہی کسی اور نے پیدا کیا ہو۔

عشق سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ اپنے نصب العین کے حصول میں انسان اس طرح جذب ہو جائے کہ دنیا کی کوئی اور جاذبیت اسے اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ عقل ہمیشہ مصلحت کوش ہوتی ہے۔ وہ بھی اپنے پیشِ نظر مقصد کا حصول چاہتی ہے لیکن اس طرح کہ اس میں انسان کو کہیں خراش تک نہ آنے پائے۔ لیکن عشق ان مصلحت کوشیوں سے بیگانہ اور بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کے سامنے ایک اور صرف ایک ہی سوال ہوتا ہے۔ یعنی اپنے نصب العین کا حصول۔ یہ چیز اس کے نزدیک دنیا کی ہر شے سے عزیز تر ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر اس کی راہ میں جان تک بھی دینا پڑ جائے تو وہ اس سے نہ صرف یہ کہ دریغ نہیں کرتا، بلکہ اس کی طرف خندہ پیشانی سے بڑھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے لئے اقبال نے کہا ہے کہ

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

یعنی عام حالات میں جان کی حفاظت ہی زندگی کا مقصود ہے لیکن انسانی زندگی میں وہ مقام بھی آجاتے ہیں جہاں جان کا دیدینا ہی حقیقت میں زندگی ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عشق آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑتا ہے درانحالیکہ عقل ابھی لبِ بام کھڑی اس سوچ میں ہوتی ہے کہ اس آگ سے بچنے کے لئے کیا تدبیر اختیار کی جائے۔ یہ ہے وہ عشق جس کی تشریح اقبال نے زیرِ نظر باب میں مختلف انداز سے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

خودی کو انہوں نے نقطۂ نور بتایا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ یہ مادی شے نہیں۔ نہ ہی مادہ کی پیداوار ہے۔ اس کا تعلق عالمِ نورانیت سے ہے اور انسان کے جسمِ خاکی کے نیچے جو شرارِ زندگی ہے وہ درحقیقت اسی خودی کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان راکھ کا ڈھیر یا آب و گل کا پتلا ہے۔ زندہ اور پائندہ انسان نہیں ہے۔ یہ خودی۔

از محبت می شود پائندہ تر
زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

محبت سے خودی مستحکم ہو جاتی ہے زندہ تو یہ پہلے بھی ہوتی ہے لیکن اس سے یہ زندہ تر ہو جاتی ہے۔ حرارت بھی اس میں پہلے سے ہوتی ہے لیکن عشق سے اس کی حرارت شعلہ انگیز بن جاتی ہے۔ وہ خود عالمِ نورانیت سے متعلق ہے اس لئے اس میں چمک بھی ہوتی ہے لیکن عشق کی سان پر چڑھ کر اس کی چمک میں بجلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

از محبت اشتعالِ جوہرش
ارتقائے ممکناتِ مضمرش

خودی کا جوہر محبت کی آگ سے بھڑک اٹھتا ہے اس کے اندر زندگی کی جس قدر ممکنات (POTENTIALITIES) چھپی ہوتی ہیں ان کی نشو و نما اور نمود عشق کی بنا پر ہوتی ہے۔

فطرت او آتش اندوزد ز عشق
عالم افروزی بیاموزد ز عشق

خودی کی فطرت، عشق سے اپنے اندر آگ اکٹھا کر لیتی ہے اس آگ سے صرف اس کے اپنے ہی اندر حرارت اور چمک نہیں پیدا ہوتی بلکہ اس سے وہ ساری دنیا کو درخشندگی اور تابندگی عطا کر دیتی ہے۔

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست
اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست

عشق موت سے نہیں ڈرتا۔ وہ خنجر سے نہیں گھبراتا۔ وہ ہنسی خوشی

(باقی کالم ملا پر)

(بقیہ صفحہ ۳ کا)

شمشیر کے نیچے اپنا گلا رکھ دیتا ہے۔ اس لئے کہ تلوار سے صرف انسان کا یہ طبیعی جسم فنا ہوتا ہے لیکن عشق کا سرچشمہ اس مادی دنیا اور عالمِ طبیعیات سے ماوراء ہے۔ اس لئے جو چیزیں انسان کی مادی زندگی کو ضرر پہنچا سکتی ہیں عشق ان کی زد سے بہت اونچا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اسے اپنے مقصد کے حصول کے لئے جان بھی دیدینی پڑے تو اس میں اسے ذرا بھی تامل نہیں ہوتا۔

در جہان ہم صلح و ہم پیکار عشق
آبِ حیواں تیغِ جوہر دار عشق

عشق اپنے ہر مخالف کے خلاف بے باکانہ برسرِ پیکار ہوتا ہے لیکن جو اس کا رفیق ہو اس کے ساتھ اس کی صلح بھی بڑی گہری ہوتی ہے۔ اسی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ عشق اگر ایک طرف تیغِ براں ہوتا ہے تو دوسری طرف وہ آبِ حیواں بھی ہے جس سے انسان کو حیاتِ دوام حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ اگر ایک طرف "اشداء علی الکفار" ہوتا ہے تو دوسری طرف "رحماء بینہم" بھی اس کی صفت ہے۔

عورت قرآن کی

(۲۸)

" دل " دو نہیں ، ایک ہی ہے تو ظاہر ہے کہ بیک وقت ایک سے زائد کے ساتھ دلی تعلق پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر اس بے تعلقی کا نتیجہ یہ نہ نکلے کہ "دلی تعلق والی بیوی" کے علاوہ بقیہ بیویوں کے ساتھ بے خیالی ، سرد مہری ، بدسلوکی برتی جائے ان کے جذبات و ضروریات کا لحاظ نہ کیا جائے۔ اسی لئے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ اگر دوسری بیوی کرنے لگو یا کرنا چاہو تو پہلی بیوی سے وہ مال واپس نہ لو جو تم اس کو مہر یا کسی طرح پر دے چکے ہو چاہے وہ سونے چاندی کا ایک بہت بڑا انبار ہی کیوں نہ ہو۔ اسی کو قرآن مجید نے "عدل" قرار دیا ہے اور اسی لئے فرمایا کہ اگر "عدل" نہ کرسکنے کا ذرا سا بھی تم کو خدشہ اور اندیشہ ہو تو پھر ایک ہی بیوی ٹھیک ہے کیونکہ اس صورت میں خدا کے احکام کی خلاف ورزی نہ ہوسکے گی اور تم سزا کے مستوجب نہ ہوگے۔ ظاہر ہے کہ جس بیوی سے محبت اور دلی وابستگی ہی نہ ہوگی اس کا درد و دکھ مرد کب ہے کو محسوس کرے گا۔

دراصل یہ قرآن کو غلط سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ کہ دونوں مشرق کچھ کا کچھ کہہ رہے ہیں۔ قرآن کو آسان کہا گیا ہے۔ اور کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے پھر اس کے بعد جو ہر لحظہ دعوتِ غور و فکر دی گئی ہے اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ سوچ سمجھ کر رائے قائم کی جائے "قرآن" قانونِ زندگی ہے ہر زمانہ اور ہر حالت کے لئے۔ اس لئے وہ ہر صورت حال کے لئے ایک قانون پیش کرتا ہے۔

جس حد تک کہ عام اور پرسکون دورِ حیات کا تعلق ہے قرآن ہرگز اس بات کی کبھی کسی طرح اجازت نہیں دیتا ہے کہ "مرد" چار بیویاں رکھیں۔ قرآن اس کو قطعی طور پر بتاتا ہے کہ صرف "ایک بیوی" کی جائے۔ اسلام رنگ رلیاں منانے کے لئے "مرد" کو اجازت نہیں دے سکتا۔ کہ کچھ کریں دھریں نہیں صرف متعدد بیویوں کے جھگڑے میں بیٹھے واجد علی شاہ اور راجہ اندر کی طرح تضیع اوقات کیا کریں۔ اسلام خالص "عملی انسان" بنے رہنے کا حکم دیتا ہے۔ مسلمان کو یہ کہاں فرصت کہ وہ دو دو چار چار بیویوں کی نازبرداریوں میں وقت کاٹیں؟ لہٰذا فطری ضرورت کی بنا پر وہ "بیوی" کی اجازت دیتا ہے۔ مگر ایک نہ صرف ایک۔ قطعی طور پر ایک۔

دو دو، تین تین، چار، چار کی جہاں پر اجازت ہے وہ سورۂ نساء کی آیت ہے۔ سورت کی ابتداء یوں ہوتی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝ وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ ۖ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ۝ وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ۝

"لوگو اپنے اس پروردگار کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں نفسِ واحدہ پیدا کیا اور اسی نفسِ واحدہ سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پیدا کر کے پھیلا دیں۔ اس خدا کا تقویٰ اختیار کرو جس کے نام پر تم باہمی سوال کرتے ہو اور باہمی رشتہ داریوں کا لحاظ کرو۔ یقیناً خدا تم پر نگہبان ہے۔ اور یتیموں کو ان کے اموال دیدیا کرو۔ اور خبیث چیزوں کو پاکیزہ چیزوں کے بدلے میں تبدیل نہ کرلو۔ ان کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر ہضم نہ کرجاؤ۔ یقیناً ایسا کرنا بہت ہی بڑا گناہ کا کام ہے اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے بارہ میں انصاف کا سلوک نہیں کرسکوگے تو ان میں سے جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار، کی تعداد میں نکاح کرلیا کرو۔ پھر اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان کے ساتھ انصاف نہیں کرسکو گے تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو، یا اس لونڈی پر اکتفا کرو جو تمہارے قبضۂ اقتدار میں ہے۔ یہ اس سے قریب تر ہے کہ تم کسی ظلم کے مرتکب نہ ہوسکو۔"

آیاتِ بالا سے یہ چیز واضح ہے کہ سلسلۂ کلام یتامیٰ کے بارے میں چل رہا ہے اس آیت سے پہلے جس میں تعددِ ازدواج کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے یتامیٰ کے اموال کو ان کے حوالہ کردینے کا حکم ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کے اموال کو اپنے مالوں کے ساتھ گڈمڈ کرکے ہضم نہ کرجایا کرو۔ ایسا کرنا بہت ہی بڑا گناہ کا کام ہے۔ اس کے بعد پھر تو وہ آیت جس میں تعددِ ازدواج کی اجازت دی گئی ہے وہ بھی اس شرط کے ساتھ شروع ہوتی ہے کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے ساتھ انصاف کا سلوک نہیں کرسکوگے تو پھر ان میں سے جو عورتیں نکاح کے قابل ہوں (النساء ہوں) ان سے دو دو، تین تین، چار چار کی تعداد میں نکاح کرسکتے ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دو دو تین تین چار چار کی تعداد میں نکاح کرسکتے ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دو دو تین تین چار چار نکاح کرنے کی اجازت اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ سوسائٹی کو اندیشہ ہو کہ یتامیٰ کے ساتھ اس کے بغیر انصاف کا سلوک نہیں کیا جاسکے گا۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو تعددِ ازدواج کی اجازت خود بخود ساقط ہوجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یتامیٰ کے متعلق اس قسم کا اندیشہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے جبکہ معاشرہ میں یتامیٰ کی کثرت اتنی ہوجائے کہ کسی دوسری صورت سے ان کی پرورش اور تربیت وغیرہ کا مناسب بندوبست نہ کیا جاسکتا ہو۔ عربی زبان میں یتامیٰ کا مفہوم بہت وسیع ہے لڑکا اس وقت تک یتیم کہلاتا ہے جب تک وہ بالغ نہ ہوجائے مگر لڑکی بالغ ہوجانے کے بعد بھی جب تک اس کی شادی نہ ہوجائے یتیم ہی کہلاتی ہے حتیٰ کہ اگر شادی ہوجانے کے بعد وہ بیوہ ہوجائے تب بھی وہ یتیم ہی کہلاتی ہے۔ لہٰذا یتامیٰ کے مفہوم میں بے باپ کے نابالغ لڑکے، نابالغ لڑکیاں، جوان، کنواری بے باپ کی لڑکیاں، بیوہ عورتیں سب شامل ہیں۔ اگر معاشرہ میں ان لوگوں کی اتنی کثرت ہوجائے کہ ان کے متعلق یہ اندیشہ ہونے لگے کہ سوسائٹی اور معاشرہ اس کے بغیر ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ نہیں کرسکتا کہ ان میں جو عورتیں نکاح کے قابل ہوں ان کو ذی استطاعت لوگ اپنے نکاح میں لے لیں تب تعددِ ازدواج کی اجازت ہے کہ اس طرح بے باپ کی کنواری لڑکیوں، بیوہ عورتوں کی پرورش کا ایک مناسب بندوبست ہوجائے گا۔ نیز یتیم اور کمسن لڑکوں اور لڑکیوں کا بھی انتظام ہوجائے گا کیونکہ جو شخص ان کی ماؤں سے نکاح کرے گا وہ ان بچوں کی پرورش کا بھی ذمہ دار بن جائے گا۔ اس طرح بہت تھوڑے سے بچے بچ جائیں گے جن کے باپ ہوں گے نہ مائیں تو ایسے تھوڑے سے بچوں کی تربیت اور پرورش کا انتظام کردینا معاشرہ کے لئے کوئی دشوار نہیں رہے گا۔ ان کے لئے کوئی دوسرا مناسب انتظام کیا جاسکے گا۔

یہاں ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ تعددِ ازدواج کی اجازت کے سلسلہ میں قرآن کے الفاظ یوں ہیں۔

فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ

ان عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں دو دو تین تین چار چار کی تعداد میں نکاح کرلیا کرو۔

یہاں مِنَ النِّسَاءِ کی قید لگائی گئی ہے۔ "نساء" عورتوں کو کہتے ہیں۔ الف و لام عربی میں نکرہ کو معرفہ بنانے کے لئے آتا ہے جیسے انگریزی میں " THE " آتا ہے۔ لہٰذا مِنَ النِّسَاءِ سے مراد عام عورتیں نہیں ہیں بلکہ وہی عورتیں ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے یتامیٰ کے ضمن میں آچکا ہے۔ اس لئے قرآن کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں ان عورتوں سے کی جانی چاہئیں جو بے باپ کی لڑکیاں ہوں یا بیوہ عورتیں ہوں۔ کیونکہ وہ خاص عورتیں جن کا پہلے ذکر آچکا ہے وہ یتامیٰ کے ضمن میں یہی عورتیں ہوسکتی ہیں عام عورتیں نہیں ہوسکتیں اس لئے نفس پرستی اور عیاشی کی خاطر ایک سے زیادہ شادیاں کرنے والے اس آیت کو اپنی عیاشیوں کا بہانہ نہیں بنا سکتے۔

فردوسِ گم گشتہ
از پرویز
قیمت:- چھ روپے

طاہرہ کے نام

(پرویز)

میری بیٹی! تم اتنی سی بات سے پریشان ہو رہی ہو کہ اللہ میاں نے قرآن میں مردوں ہی کو کیوں مخاطب کیا ہے۔ عورتوں کو بھی کیوں مخاطب نہیں کیا؟ اس سوال کا جواب تو بعد میں دوں گا، لیکن اگر ایک بات کہوں تو خفا تو نہ ہوگی؟ اس قسم کی پریشانیاں درحقیقت غیر شعوری طور پر اس احساس کمتری (Inferiority Complex) کی مظہر ہیں کہ عورت کی حیثیت مرد کے مقابلہ میں پست رکھی گئی ہے۔ حیرت ہے کہ تم قرآن کی طالب علم ہونے کے باوجود ... اس وقت تک اس غیر قرآنی تصور کو اپنے تحت الشعور سے نکال نہیں سکیں؟ میں جانتا ہوں کہ صدیوں سے متوارث چلے آنے والے معتقدات جو دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکے ہوں، بڑی مشکل سے نکلا کرتے ہیں۔ تم نے سلمیٰ کے ابا کو دیکھا تھا۔ تین پشتیں ہو گئی تھیں مسلمان ہوئے لیکن جب چھینک آتی، بے اختیار مُنہ سے "جے نندی" نکل جاتا۔ اسے چچا مرحوم نے ہزار سمجھایا (اور وہ خود بھی جانتا تھا) کہ چھینک آنے پر "الحمد للہ" کہتے ہیں لیکن چھینک آنے پر پھر "جے نندی" ہی کہتا۔ جب "جے نندی" خون کے ذرات میں حلول کر جائے تو اس کا باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم کیا جانیں کتنی "جے نندیاں" ہیں جو اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں چھپی بیٹھی ہیں۔ جب قرآن نے بنی اسرائیل کے متعلق کہا تھا کہ واشربوا فی قلوبھم العجل (گوسالہ کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکی تھی) تو اس سے یہی مُراد تھی۔ لیکن قرآن کا دعوے بھی تو شفاء لما فی الصدور ہے۔ وہ "دل کی بیماریوں" کا علاج کرتا ہے (اختلاج قلب کا نہیں، فساد قلب کا۔ اور سچ پوچھو تو اختلاج قلب بھی بڑی حد تک فساد قلب ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اب تو مغرب کے ارباب تحقیق اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ انسان کے جسم کی بے شمار بیماریاں نفسیاتی عوارض (PSYCHIC DISORDER) کی وجہ سے ہوتی ہیں اور ان کا صحیح علاج نفسیاتی اصلاح ہے۔) لہٰذا قرآن کی رُو سے ان غلط خیالات کا دل سے نکل جانا نہایت ضروری ہے۔

اب آؤ تم اپنے سوال کی طرف۔ تمہیں یہ معلوم ہے کہ قرآن تمام نوع انسانی کے لئے ہے۔ اس کا اولین مخاطب انسان ہے۔ (یا ایھا الناس سے یہی مُراد ہے)۔ وہ بنی آدم کی ہدایت کے لئے آیا ہے۔

اب تم یہ بتاؤ کہ کیا "انسان" اور "بنی آدم" صرف مردوں کو کہا جاتا ہے، یا اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں؟ اگر تم اپنے آپ کو انسان نہیں سمجھتیں تو اور بات ہے، ورنہ "یا ایھا الناس" (اے نوع انسانی) میں مردوں اور عورتوں دونوں کا تخاطب موجود ہے۔ اب رہا یہ کہ قرآن نے جہاں جماعتی حیثیت سے "مومنین" کو مخاطب کیا ہے تو وہاں بھی مذکر ہی کے صیغے آئے ہیں (یا ایھا الذین آمنوا) تو یہ تو زبان کا عام قاعدہ ہے کہ جہاں مخلوط جماعت کو مخاطب کیا جائے وہاں صیغے مذکر کے استعمال کئے جائیں۔ خود تمہارے ہاں بھی جب کوئی مقرر کسی مخلوط مجمع کو مخاطب کرتا ہے (جس میں مرد اور عورتیں سب موجود ہوں) تو شروع میں خواتین و حضرات کی تخصیص کر دیتا ہے لیکن اس کے بعد اپنی ساری تقریر میں صیغے مذکر ہی کے استعمال کرتا ہے۔ وہ بلا تکلف کہتا چلا جاتا ہے کہ "آپ یہ کہتے ہیں کہ......" اور "آپ اس کا کبھی خیال نہیں کرتے کہ....."

یہ سب مذکر کے صیغے ہیں لیکن اس سے مُراد مجمع کے مرد اور عورتیں سب ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق تو تم نے کبھی نہیں کہا کہ یہ ہماری توہین ہے کہ ہمیں مجمع میں بلایا تو گیا لیکن مقرر نے باتیں سب مردوں ہی سے کیں؟ اس لئے کہ تم سمجھتی ہو کہ مقرر نے اگرچہ صیغے مذکر کے استعمال کئے لیکن ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے۔ اس لئے کہ یہ زبان کا قاعدہ ہے کہ مخلوط اور مشترک تخاطب میں صیغے مذکر کے استعمال کئے جائیں۔ یہی انداز قرآن نے اختیار کیا ہے۔ یعنی جہاں اس نے مومنین کو من حیث الجماعت مخاطب کیا ہے وہاں صیغے اگرچہ مذکر کے استعمال ہوئے ہیں لیکن تخاطب مردوں اور عورتوں دونوں سے ہے۔ اس حقیقت کو اجاگر کرنے کے لئے کہ جماعت مومنین میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں، اس نے ان دونوں طبقات کا الگ الگ ذکر کر کے بھی ان کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ سورۂ احزاب میں دیکھو، کس طرح اس جماعت کے مرد اور عورتیں دوش بدوش چلے آ رہے ہیں۔ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ مسلم مرد اور مسلم عورتیں۔ جو قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوں۔ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ مومن مرد اور مومن عورتیں۔ جو ان قوانین کی محض میکانکی طور پر یا زبردستی اطاعت نہ کریں بلکہ ان کی صداقت اور نتیجہ خیزی پر دل کی گہرائیوں میں یقین رکھیں۔ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ۔ وہ مرد اور عورتیں جو اپنی صلاحیتوں کی کامل نشوونما کے بعد، انہیں وہیں صرف کریں جہاں صرف کرنے کا حکم نظام خداوندی کی طرف سے ملے۔ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وہ مرد اور وہ عورتیں جو اس عہد کو جو انہوں نے اپنے خدا سے کیا ہے، اپنے حسن عمل سے سچ کر کے دکھائیں۔ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وہ مرد اور عورتیں جو اپنے اعمال اور کردار میں مستقل مزاج اور ثابت قدم رہیں۔ جن کے پائے استقلال میں

لغزش نہ آئے۔ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وہ مرد اور عورتیں جو نوعِ انسانی کی خدمت کے لئے ہمیشہ شاخِ ثمردار کی طرح جھکے رہیں۔ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وہ مرد اور عورتیں جو اپنا سب کچھ نظامِ خداوندی پر نچھاور کر دینے کے لئے تیار ہوں وَالصّٰٓئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ۔ وہ مرد اور عورتیں جن کا شیوۂ زندگی یہ ہے کہ قوانینِ خداوندی نے جہاں جہاں اور جن جن باتوں سے رُکنے کا حکم دیا ہے، وہاں سے رُکے رہتے ہیں۔ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ۔ وہ مرد اور عورتیں جو اپنی عصمت کی پوری پوری حفاظت کریں۔ وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰهَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ۔ وہ مرد اور عورتیں جو زندگی کے ہر قدم پر قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھیں۔ انہیں کبھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا (۳۳/۳۵) یہی وہ مرد اور عورتیں جنہیں نظامِ خداوندی ہر قسم کی تباہیوں سے محفوظ رکھے گا اور ان کے سعی و عمل کا بہت بڑا اجر دے گا۔

کیوں طاہرہ! کیا تمہیں اب بھی گلہ رہے گا کہ قرآن کریم میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ مخاطب نہیں کیا گیا۔؟

۲۔ تمہارا دوسرا سوال پڑھ کر مجھے بے ساختہ ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک صاحب نے اپنی شادی کے لئے دن کے دن پہنچنا تھا۔ اتفاق سے گاڑی چھوٹ گئی۔ اب کوئی شکل ہی نہ تھی کہ وہ تاریخ اور وقت مقررہ پر وہاں پہنچ سکتے۔ وہ بہت گھبرائے۔ اس بدحواسی میں تار گھر گئے اور جھٹ سے اپنی ہونے والی بیوی کے نام تار بھیج دیا کہ "جب تک میں نہ پہنچ جاؤں تم شادی نہ کرنا"!

تم کہتی ہو کہ قرآن میں یہ تو لکھا ہے کہ جنت میں مردوں کو اچھی اچھی عورتیں ملیں گی لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ عورتوں کو بھی مرد ملیں گے یا نہیں؟ ذرا سوچو طاہرہ! کہ مردوں کو جو عورتیں ملیں گی تو اُن عورتوں کو وہ مرد ملیں گے یا نہیں؟ یعنی (مثلاً) وہاں حامد کو عائشہ بطور بیوی کے ملے گی تو کیا عائشہ کو حامد بطور خاوند نہیں ملے گا؟ جب میاں کو بیوی ملتی ہے تو اس بیوی کو وہ میاں بھی تو ملتا ہے!

جنت کے متعلق، طاہرہ! ایک بنیادی حقیقت اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہیئے کیونکہ اس کے سمجھے بغیر، بہت سی باتوں میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن میں ایک تو اس جنت کا ذکر ہے جو مرنے کے بعد مستقبل کی زندگی میں ملے گی اس کے متعلق واضح الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ اس کی کنہ و حقیقت اور کیفیت و ماہیت تمہارے شعور کی موجودہ سطح کے مطابق، تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتی فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ۔ جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۳۲/۱۷) کسی شخص کو معلوم نہیں کہ اس کے اعمال کے بدلے میں اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان اس کے لئے مخفی رکھا گیا ہے وہ کیا ہے۔ یہ جنت مکان (SPACE) کی چار دیواری میں محصور نہیں۔ اس کی وسعت ارض و سما کو محیط ہے۔ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (۳/۱۳۲) لہٰذا اُس جنت کی زندگی کیسی ہو گی، اسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن دوسری جنت وہ ہے جو نظامِ خداوندی کی اتباع میں اسی دُنیا میں متشکل ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ جنتی معاشرہ جو قرآن کے خطوط کے مطابق قائم ہوتا ہے، اس جنت کی تفاصیل اسی دُنیا سے متعلق ہیں اور نہ صرف یہ کہ ہماری سمجھ میں آ سکتی ہیں بلکہ ہم خود اس جنت کو پیدا کر سکتے اور اس کی فضاؤں میں زندگی گزار سکتے ہیں۔ یہ ہے وہ جنت جس میں قرآن نے مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور کرنا چاہیئے بھی۔ اس لئے کہ وہ کونسا معاشرہ ہے جو عورتوں کے بغیر، تنہا مردوں کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے، اس جنتی معاشرہ کی عورتوں کی خصوصیات کیا ہیں؟ وہی جو مومن عورتوں (مومنات) کی خصوصیات ہیں۔ مومن عورتوں سے کہا گیا ہے کہ جب وہ چلیں تو شرم و حیا سے اپنی نگاہوں کو نیچے کئے ہوئے چلیں۔ بیباکانہ انداز سے ہر ایک کو دعوتِ تماشا نہ دیتی پھریں۔ انہی کو قرآن نے جنتی معاشرہ میں قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ (۵۵/۵۶) کہا ہے۔ یعنی نگاہوں کو نیچے رکھنے والیاں۔ قرآن نے مومن عورتوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ اپنی عصمت کی پوری پوری حفاظت کرتی ہیں۔ انہی کے متعلق جنتی معاشرہ میں کہا ہے کہ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ (۵۵/۵۶)۔ انہیں ان کے خاوندوں سے پہلے، اپنوں اور بیگانوں میں سے کسی نے چھوا تک نہیں ہو گا۔ وہاں ہر نوجوان کو جو کسی جگہ شادی کرنا چاہے گا، دل کا پورا اطمینان ہو گا کہ اس کی منگیتر کو کسی دوسرے کا ہاتھ تک نہیں لگا۔ کتنا بڑا ہے یہ اطمینان جو کسی شادی کرنے والے پاکباز انسان کو حاصل ہو جائے۔ انہی بیگمات کو قرآن نے عالی مرتبت، بلند پایہ خواتین کہہ کر پکارا ہے۔ سورۂ واقعہ میں جو فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ (۵۶/۳۴) آیا ہے تو اس کے یہی معنی ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ عہدِ جاہلیت میں پرورش یافتہ عورت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ بڑی جذباتی ہوتی ہے اور اس وجہ سے وہ متنازعہ فیہ معاملہ میں اپنے دعوے (CASE) کو اچھی طرح بیان نہیں کر سکتی۔ وَهُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ (۴۳/۱۸) لیکن قرآنی معاشرہ میں یہی عورت مناسب تعلیم و تربیت سے یکسر نئی مخلوق بن جائے گی اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْکَارًا (۵۶/۳۵-۳۶) اور نہایت فصیح البیان ہو جائے گی۔ (اس سے یہ مُراد نہیں کہ اس تعلیم و تربیت سے عورت کے جذبات فنا ہو جائیں گے۔ مرد کے مقابلہ میں عورت زیادہ جذباتی واقع ہوئی ہے اور لئے

زیادہ جذباتی رہنا چاہیئے کیونکہ اس کے ذمّے فطرت کی طرف سے جو ذمّہ داریاں عائد ہوئی ہیں ان کا زیادہ تعلق جذبات سے ہے۔ مناسب تعلیم و تربیت سے ہوتا یہ ہے کہ یہ جذبات جہالت کے جذبات بننے کے بجائے صحیح مقصد میں صرف ہونے والے جذبات بن جاتے ہیں۔) اس کے ساتھ ہی بڑی خوش گل اور تندرست و توانا عُرُبًا اَتْرَابًا۔ (۵۶/۳۷) ایسی عورتیں جن کے گھروں میں آئیں وہ کس قدر صاحبِ یُمن و سعادت ہوں گے؟ لِاَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ (۵۶/۳۸)۔ اس قسم کی قلب و نگاہ کی پاکیزگی اور فکر و نظر کی بلندی کی حامل عورتیں، یقیناً انہی جیسے مردوں کے گھروں میں آئیں گی، اس لئے کہ اس معاشرہ کی تشکیل کے بعد عائلی زندگی کا بنیادی اصول یہ ہوگا کہ اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ (۲۴/۲۶) طیب عورتیں طیب مردوں کے لئے اور طیب مرد طیب عورتوں کے لئے۔ اس سے گھر کی زندگی جنّت کی زندگی بنتی ہے اور جنّتی معاشرہ کی ابتداء گھروں ہی سے ہوتی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو، طاہرہ! بڑے عجیب انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے نزدیک عورت اور مرد میں فکر و نظر، خیالات و تصورات، معتقدات و اصولات اور مسلک و منہاج کا اختلاف جہنم پیدا کر دیتا ہے اس کے برعکس، ان چیزوں میں ہم آہنگی اور یک رنگی گھر کو جنّت بنا دیتی ہے۔ اس کے لئے اس نے مومن اور مشرک کی مثال بطورِ مثال بیان کی ہے کیونکہ، قرآنی نقطۂ نگاہ سے، شرک اور توحید کا اختلاف دُنیا میں سب سے بڑا اور سب سے شدید (EXTREME) اختلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی مومن مرد کسی مشرک عورت سے شادی نہ کرے نہ کوئی مومن عورت مشرک مرد سے نکاح کرے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اس قسم کے ازدواجی رشتوں کو جائز قرار دینے والے یَدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ تمہیں جہنم کی طرف بلاتے ہیں۔ اس کے برعکس، یک رنگی و ہم آہنگی کی شادی سے خدا تمہیں جنّت کی طرف دعوت دیتا ہے وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلَی الْجَنَّۃِ وَالْمَغْفِرَۃِ (۲/۲۲۱) گھر کے اندر جنّت اور گھر سے باہر ہر قسم کی شرانگیزیوں سے حفاظت۔ یہ ہے طاہرہ! جنّتی معاشرہ میں مرد اور عورت کی پوزیشن۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا وہ اعتراض کہاں باقی رہتا ہے کہ قرآن نے جنّت میں مردوں کے لئے تو "حوریں" تجویز کی ہیں لیکن عورتوں کے لئے کچھ نہیں کہا؟ ضمناً تمہیں بتا دوں کہ عربی زبان میں حورِ عین کے معنی ہیں پاکیزہ فکر (PURE AND CLEAN NTELLECT)۔ لہٰذا جنّت کے جوڑے پاکیزگیٔ فکر و نظر کے حسین مجسّمے ہوں گے۔ سوچو بیٹی! کہ کس قدر دل کا سرور اور آنکھوں کا نور لئے ہوئے ہوگا وہ معاشرہ جس میں مرد اور عورتیں ان خصوصیات کی حامل ہوں گی طوبیٰ لھم و حسن مآب۔ پھر یہ بھی سمجھ رکھو کہ عربی زبان میں "زوج" (جمع ازواج) کے معنی بیوی ہی نہیں۔ اس کے معنی رفیق اور ساتھی کے ہیں۔ اسی رفاقت کی وجہ سے میاں بیوی کا زوج اور بیوی میاں کی زوج ہوتی ہے۔ لہٰذا قرآن نے جہاں "ازواجِ مطہرات" کہا ہے تو اس کے ہر جگہ معنی پاکیزہ بیویاں ہی نہیں۔ اس کے معنی پاکباز رفقاء بھی ہیں (میں جانتا ہوں کہ ان الفاظ کے یہ معانی دیکھ کر تم پھر تقاضا شروع کر دوگی کہ قرآنی لغت بہت جلد شائع ہونی چاہیئے۔ اس کیلئے تم اطمینان رکھو کہ اس میں ذرا سی بھی کوتاہی نہیں ہو رہی)۔

اگرچہ دُنیا کے کسی مذہب میں بھی (جس شکل میں وہ آج ہمارے سامنے موجود ہیں) عورت کو اس کا صحیح مقام نہیں دیا گیا۔ لیکن اس باب میں عیسائیت انتہا تک پہنچ گئی ہے۔ اُس نے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ جنّت سے آدم کو نکلوانے کا موجب اس کی بیوی ہی تھی۔ یہ ابلیس کے چکمہ میں آگئی اور اس نے آدم کو پھسلا دیا۔ اس کے بعد اس مذہب میں عورت کے خلاف انتہائی نفرت کے جذبات پرورش پانے لگے۔ اس پر مستزاد یہ کہ حضرت عیسیٰؑ کی تجرد کی زندگی نے عیسائیوں کے دل میں عورت کی طرف سے اور بھی بُعد پیدا کر دیا۔ پھر جب عیسائیت اور خانقاہیت لازم و ملزوم بن گئے تو تجرد کی زندگی کو روحانی ترقی کیلئے لازمی جزو قرار دیا گیا۔ انہی اعتقادات کا نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں عورت تمام برائیوں کا سرچشمہ قرار پا گئی۔ عیسائی پادریوں کی طرف سے جو آئے دن اعتراضات ہوتے رہتے ہیں کہ قرآن کی جنّت میں عورت دکھائی دیتی ہے۔ وہ بھی اسی عقیدہ کا نتیجہ ہے۔ قرآن نے سب سے پہلے اس غلط خیال کی تردید کی کہ آدم کو جنّت سے نکلوانے کا موجب اس کی بیوی تھی۔ اس نے کہا کہ آدم اور اس کی بیوی دونوں کو لغزش ہوئی اور پھر ان کی توبہ قبول کر لی گئی۔ (قرآن کے قصّۂ آدم کے متعلق کچھ الگ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ تم اسے "ابلیس و آدم" میں خود دیکھ چکی ہو)

میں ابھی پوری طرح اچھا نہیں ہوا اس لئے زیادہ تفصیل سے خط نہیں لکھ سکتا۔ امید ہے انہی مختصر سے اشارات میں تمہیں اپنے سوالات کا اطمینان بخش جواب مل جائے گا۔ سلیم میاں سے میری دعا کہنا۔ ان کے خط کا جواب بھی میرے ذمّہ ہے۔

والسلام

(پرویز)

سلیم کے نام
از پرویز
نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا شگفتہ مدلّل اور اچھوتا جواب۔
قیمت چھ روپے

اسلام پر ہندو تہذیب کے اثرات

تلخیص و ترجمہ: محترم ڈاکٹر احمد امین مصری مرحوم

(۱)

زمانہ جاہلیت میں بھی عرب پہلے سے ہندوستان سے واقف تھے۔ ہندوستان کے ساتھ ان کے تجارتی روابط تھے۔ عرب عود — ایک خوشبودار لکڑی جو ہندوستان سے لائی جاتی تھی — کے بہت شیدا تھے۔ عدی بن الرقاع کا شعر ہے ؎

(کس قدر آگیں ہیں جنہیں میں راتوں کو دیکھتا رہا ہوں جو عود ہندی اور آگ کے گڑھے کو کھائے جا رہی تھیں)

علماء کا خیال ہے کہ اس شعر میں "ہندی" سے مراد وہ خوشبودار عود ہی ہے جو ہندوستان سے لایا جاتا تھا۔ ساتھ ہی وہ ہندوستان کی بنی ہوئی تلوار کے بھی بڑے مداح تھے۔ چنانچہ جو تلواریں ہندوستانی لوہے سے بنائی جاتی تھیں۔ ان کو وہ مُهَنَّد کہتے تھے "سَيْفٌ مُهَنَّدٌ" اور "هِنْدِيٌّ" اور "هِنْدَوَانِيٌّ" کے الفاظ ان کے ہاں ان تلواروں کے لئے عام طور سے مستعمل تھے جو ہندوستان کے شہروں میں مضبوطی سے بنائی جاتی تھیں۔ اس لفظ سے انہوں نے هَنَّدَ السَّيْفَ (تلوار کو تیز کر دیا) جیسے الفاظ بنا لئے تھے۔ چنانچہ کُلُّ حُسَامٍ مُحْكَمُ التَّهْنِيْدِ (ہر مضبوط دھار والی تلوار) جیسی ترکیبیں ان کے ہاں رائج تھیں۔ ازہری نے کہا ہے کہ "تَهْنِيْدٌ" کے اصل معنی "ہندوستان جیسا کام کرنا" ہوتے ہیں[۱]۔ عربوں نے اپنی اکثر عورتوں کے نام بھی "هِنْدٌ" رکھ دیئے تھے۔ حتیٰ کہ هِنْدٌ اَلْهُنُوْدِ جیسے نام بھی ان کے ہاں ملتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان ناموں کی بنیاد ہندوستان کا ملک ہی تھا۔ یا کچھ اور۔

سرزمین ہند میں عربوں کی فتوحات

مسلمانوں نے جب فارس اور عراق کو فتح کر لیا تو انہوں نے ہندوستان کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ بلاذری کا بیان ہے کہ جب حضرت عثمان بن عفان خلیفہ ہوئے اور انہوں نے عبداللہ بن عامر بن کریز کو عراق کا گورنر بنایا تو اسے تحریر فرمایا کہ ہندوستان کی طرف کسی آدمی کو بھیجو جو وہاں کے متعلق مکمل معلومات حاصل کر کے آئے اور انہیں آکر بتائے۔ عبداللہ ابن عامر نے حکیم بن جبلہ عبدی کو ہندوستان روانہ کیا۔ اور جب وہ واپس آیا تو اسے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت عثمانؓ نے اس سے ہندوستان کے حالات دریافت کئے تو اس نے بتایا

مَاءُهَا وَشَلٌ، وَتَمْرُهَا دَقَلٌ، وَلِصُّهَا بَطَلٌ، اِنْ قَلَّ الْجَيْشُ بِهَا ضَاعُوْا وَاِنْ كَثُرُوْا جَاعُوْا۔ ہندوستان میں پانی بہت کم اور کھجوریں بہت گھٹیا قسم کی ہیں۔ وہاں کے چور اور ڈاکو بڑے بدمعاش ہیں۔ اگر تھوڑا لشکر بھیجا جائے تو وہ ملک تباہ ہو جائے گا۔ اور اگر بہت فوج بھیجی جائے تو وہ بھوکوں مر جائے گی۔ حکیم بن جبلہ کی یہ باتیں سن کر حضرت عثمانؓ نے کہا کہ مجھے وہاں کی باتیں بتا رہے ہو یا محض قافیہ پیمائی کر رہے ہو؟ حکیم بن جبلہ نے کہا کہ نہیں حضور! میں وہاں کی باتیں بتا رہا ہوں۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے ہندوستان کا خیال چھوڑ دیا۔ اور ادھر کوئی فوج نہیں بھیجی[۲]۔ لیکن مسلمان ان علاقوں پر چھاپے مارتے رہتے۔ اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ ولید بن عبدالملک کے عہد یعنی ۹۱ھ میں حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم ثقفی کو ہندوستان بھیجا۔ جنہوں نے اس کے ایک بڑے حصہ کو فتح کر لیا جسے سندھ کہا جاتا ہے۔ وہ دیبل (DAIBUL) اور نیرانکوٹ (جسے آجکل حیدرآباد کہتے ہیں) کو فتح کر کے راوی کی طرف بڑھے۔ اور آخر میں ملتان کو بھی فتح کر لیا۔ محمد بن قاسم اس فوج کے کمانڈر و قائد تھے۔ یہ اس وقت بالکل کمسن نوجوان تھے۔ ان کی عمر بیس سال بھی نہیں تھی۔ کسی نے کہا ہے ؎

مروت، سخاوت، اور کرم محمد بن قاسم بن محمد پر ختم ہے۔ سترہ سال کی عمر میں فوجوں کی کمان کی۔ حیرت ہے کہ وہ پیدائشی سردار تھے۔

کسی دوسرے شاعر کا قول ہے ؎

انہوں نے سترہ سال کی عمر میں لوگوں کی کمان کی۔ جبکہ ان کے ہم عمر بچے کھیل کود میں لگے رہتے ہیں۔

مسلمانوں کو ان فتوحات میں بے شمار مال غنیمت اور جنگی قیدی ہاتھ لگے۔ جو دوسرے جنگی قیدیوں کی طرح پوری مملکت اسلامیہ میں پھیل گئے۔ اور اس طرح سندھی قوم ملت اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی کا ایک اہم عنصر بن گئی۔ اغانی کا بیان ہے کہ جنید بن عبدالرحمٰن مری نے خالد بن عبداللہ قسری کے پاس ہندوستان کے سینکڑوں جنگی قیدی بھیجے۔ انہوں نے ان جنگی قیدیوں کو قریش کے لوگوں اور دیگر ممتاز لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک حسین و جمیل لونڈی باقی رہ گئی جس کے بدن پر اسی کے ملک کا لباس تھا جو دو چادریں تھیں ایک نچلے حصہ پر اور ایک اوپر کے حصہ پر۔ خالد بن عبداللہ القسری نے ابوالنجم شاعر سے کہا۔ کہ تمہارے پاس اس لونڈی کے بارے میں کچھ ہو تو کہو اور اسے لے لو۔ ابوالنجم نے امیر کو دعائیں دے کر اپنا وہ مشہور رجز پڑھا۔ جس کا مطلع یہ تھا ؎

جاٹ لڑکیوں میں سے ایک حسینہ پر میرا دل آگیا[۳]

جس عہد کی ہم تاریخ بیان کر رہے ہیں۔ اس میں سندھ خلفائے عباسیہ کے زیر نگیں تھا۔ ابوجعفر منصور نے ۱۴۲ھ میں سندھ پر ہشام بن عمرو تغلبی کو گورنر مقرر کیا۔ اس نے شمال کی طرف فتوحات میں اور وسعت پیدا کی اور کابل و کشمیر کو بھی فتح کر لیا۔ اور بہت جنگی قیدی حاصل کئے[۴] سندھ اور مملکت اسلامیہ کے درمیان تجارتی تعلقات قائم کافی استوار ہو گئے تھے۔ چنانچہ سندھ سے عود، شکر اور ہندوستان کی لکڑیاں درآمد کی جاتی تھیں[۵]۔

سندھ میں علمی حرکت

فتوحات مکمل نہیں ہوئی تھیں کہ علمی حرکت شروع ہو گئی۔ فاتحین میں سے کچھ لوگ بلند پایہ عالم تھے۔ چنانچہ ربیع بن صبیح بصری مشہور محدثین میں سے تھے۔ ان کو حدیث کی تدوین میں اولیت کا فخر حاصل ہے۔ آپ اس فوج میں موجود تھے جو ہندوستان کے محاذ پر جہاد کرنے کے لئے مہدی نے ۱۵۹ھ میں روانہ کی تھی۔ ان کا انتقال بھی سندھ ہی میں ہوا[۶]۔ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں سندھ کے بعض محدثین کا تذکرہ کیا ہے[۷]۔ بہرحال یہ اسلامی فوج محض فاتح ہی نہیں تھی۔ بلکہ اسلامی دعوت کو پھیلانے والی اور معلم بھی تھی۔

دوسری طرف کچھ ہی عرصے کے بعد ان غلاموں میں سے جو ہندوستان سے لائے گئے لوٹے گئے اور فوج میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ اور ان کی اولاد میں سے بڑے بڑے شعراء، علمائے لغت اور محدثین پیدا ہو گئے۔ چنانچہ شعراء میں سے ابوعطار سندھی ایک مشہور شاعر گذرے ہیں جنہوں نے عباسی اور اموی دونوں کے عہد حکومت کو پایا ہے۔ ان کا باپ سندھی تھا ان کی زبان صاف نہیں تھی۔ ان کا بیٹا مسلمانوں میں پلا بڑھا۔ اور ایک بلند پایہ شاعر ہوا اگرچہ بیٹے کی زبان میں بھی سخت لکنت تھی۔ چنانچہ وہ مَرْحَبًا کو مَرْهَبًا، حَيَّاكُمُ اللّٰهُ کو هَيَّاكُمُ اللّٰهُ، زُجّ کو زُزّ، جَرَادَةٌ کو زَرَادَةٌ، اور شَيْطَانٌ کو سَيْطَانٌ، اَظْلَمُ کو اَزْلَمُ بولتے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے مجبور ہو کر ایک لڑکا محض اس لئے رکھ چھوڑا تھا کہ وہ ان کے اشعار کو پڑھ کر سنایا کرے تاکہ انہیں اپنے اشعار خود نہ سنانے پڑیں۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار ان کی حالت کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں ؎

اے ابن سلیم! مجھے راویوں نے عاجز کر دیا ہے اور میری زبان میرے اشعار کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر ہے۔ وہ مضامین جو میرے سینہ میں موجزن ہیں مجھ پر غالب آ گئے ہیں۔ لیکن عجمی ہونے کی وجہ سے وہ میرے غلبہ و تسلط سے نکل بھاگتے ہیں۔ نگاہیں مجھے نشانہ بنا لیتی ہیں۔ کیونکہ میرا رنگ سیاہ ہے جو تمام رنگوں میں بدترین رنگ ہے۔

میں نے سارے معاملات کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ مگر اپنی زبان کے لئے کیا تدبیر اختیار کروں؟

میری آرزو یہ ہے کہ کاش میں اپنے اشعار کو فصاحت کے ساتھ سنا

---

[۱] لسان العرب [۲] البلاذری صفحہ ۴۳۳ [۳] آغانی صفحہ ۷۹ جلد ۹ [۴] المسالک والممالک لابن خرداذبہ صفحہ ۶۲ [۵] ابن الاثیر صفحہ ۱۲ جلد ۶ [۶] صفحہ ۲۵۶ جلد ۲ [۷] صفحہ ۲۹۵ جلد ۲

سکتا۔ خواہ اس کے عوض میں مجھے اپنی کچھ انگلیاں قربان کرنی پڑتیں۔

ابوجعفر منصور نے جب لوگوں کو سیاہ لباس پہننے کا حکم دیا تو انھوں نے کہا تھا ؎

میں خدا کی نعمت کی ناشکری نہیں کرتا۔ مجھے تو میرے رنگ کے ساتھ
سیاہ لباس اور بوسیدہ ٹوپی پہنا دی گئی ہے۔
میں نے بادلِ ناخواستہ ایک بیعت کے بعد کھوٹی بیعت کر لی۔ کیونکہ
سارا معاملہ ہی کھوٹا تھا۔

خلفائے عباسی ابوعطاء سندھی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ بنو امیہ کی مدح میں بہت کچھ کہتا رہتا تھا۔ جب حکومت بدل گئی تو اس نے بھی بدل جانا چاہا۔ مگر بنو عباس اس سے مطمئن نہ ہوئے تو اس نے اس کی ہجو کہنی شروع کر دی۔ چنانچہ اس کا یہ شعر مشہور ہے ؎

کاش بنو مروان کا ظلم و جور ہم پر لوٹ آتا
اور کاش بنو عباس کا یہ انصاف آگ میں جھونک دیا جاتا[1]

اس کے زیادہ تر اشعار ہم تک نہیں پہنچ سکے۔ جن سے معلوم ہو سکتا کہ ان میں کچھ ایسے مضامین بھی تھے یا نہیں۔ جو انھوں نے اپنی سندھی اصل سے حاصل کئے ہوں۔

علمائے لغت میں سے جو سندی الاصل تھے۔ ابن الاعرابی بہت مشہور ہیں (ان کے باپ زیاد ایک سندھی غلام تھے) ابن الاعرابی لغت ادب اور شعر کا ایک بلند پایۂ پہاڑ تھے۔ انھوں نے بہت کتابیں تصنیف کیں۔ لغت کے بہت سے امام ان کے شاگرد تھے۔ جن میں بہت مشہور ثعلب اور ابن السکیت ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی کتابیں ہم تک نہیں پہنچیں۔ محض ایک چھوٹی سی کتاب جس میں کنوؤں کے نام اور ان سے صفات کا بیان ہے[2]۔ ایک اور دوسری کتاب جس میں گھوڑوں کے نام اور ان کے انساب بیان کئے ہیں آجکل مل سکتی ہیں[3]۔ ان کی ایک تصنیف کتاب الانواء کے نام سے بھی تھی۔ یہ کتاب اگر ہم تک پہنچ جاتی تو پتہ لگ سکتا تھا کہ کیا انھوں نے ہندوستانی علوم سے بھی کوئی اثر لیا ہے یا محض عربی علوم پر ہی اکتفا کر کے اسی نہج پر یہ کتاب تصنیف کی ہے۔ جیسا کہ دوسرے علمائے عرب نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔

ہندوستانی محدثین میں سے ابومعشر نجیح سندھی صاحب المغازی ایک محدث گزرے ہیں۔ جنھوں نے امام نافع اور دیگر تابعین سے حدیثیں سنی تھیں۔ یہ توتلے تھے۔ چنانچہ حدثنا محمد کعب کو محمد بن قعب کہا کرتے تھے۔

اس قسم کے لوگ اس مخلوط تہذیب کا نمونہ تھے جو مسلمانوں اور ہندوؤں کی آمیزش سے پیدا ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے اسلام کو قبول کر لیا تھا۔ اسلامی اور عربی علوم کو حاصل کر لیا تھا۔ اور ان میں سے بعض حضرات علم کے بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ جاحظ کا یہ قول ہم نقل کر چکے ہیں کہ سندھی لوگ مال سے متعلق حسن انتظام میں بہت مشہور تھے۔ چنانچہ بصرہ میں کوئی صراف الیسا نہ تھا۔ جس کی تحصیل کا محافظ و نگراں سندھی نہ ہو۔

اب ہم اس موضوع کے دوسرے گوشہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یعنی اسلامی تہذیب پر ہندوؤں نے کیا اثرات ڈالے۔

اسلامی تہذیب پر ہندوؤں کے اثرات

اسلامی تہذیب پر ہندوؤں کے اثرات دو جہت سے تھے۔ ایک تو ڈائرکٹ (براہ راست) اثر تھا۔ یعنی خود مسلمان تجارتی راہ سے ہندوستان سے ارتباط رکھتے تھے۔ پھر عربی فتوحات کی راہ سے بھی ایک ارتباط قائم ہوا۔ ان فتوحات نے سندھ کے مفتوحہ علاقہ کو مملکت اسلامی کا ایک جزو بنا دیا تھا۔ جو اسلامی نظام کے تابع فرمان تھا۔ اور اس پر اسلامی قوانین ہی نافذ ہوتے تھے۔ مسلمان اس حصہ میں آتے تھے۔ اور ہندو اس علاقہ سے عالم اسلامی کے مختلف گوشوں تک جاتے تھے۔ اور دونوں ہی اپنی اپنی تہذیبوں کو ساتھ لے کر جاتے اور آپس میں ایک دوسرے سے اس کا تبادلہ کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح تجارتی سامانوں کا تبادلہ ہوا کرتا تھا۔

ان اثرات کی ایک دوسری جہت بھی تھی جو ان ڈائرکٹ (بالواسطہ) تھی۔ اور وہ ہندو تہذیب کا ایرانی واسطہ سے مسلمانوں میں منتقل ہونا تھا۔ ایرانیوں کے ہندوستان سے اسلامی فتوحات سے بہت پہلے سے گہرے تعلقات تھے۔ انھوں نے ہندوؤں پر اثرات ڈالے تھے۔ اور ان سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ انھوں نے ہندو تہذیب میں سے بہت کچھ لے کر اپنی تہذیب میں شامل کر لیا تھا۔ جب یہ ایرانی تہذیب عربوں میں منتقل ہوئی۔ تو اس کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ اس کے ذیل میں ہندو تہذیب کی بہت سی چیزیں بھی عربی میں منتقل ہو گئیں۔

مسلمان ہندوؤں کو ان چار قوموں میں شمار کرتے تھے جو ممتاز صفات کی مالک تھیں یہ چاروں قومیں ایرانی۔ ہندی، رومی اور چینی تھیں۔ جاحظ نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ ہندوستانی لوگ، حساب علم نجوم۔ اسرار طب۔ خیراد اور بڑھئی گری اور تصاویر اور دوسری بہت سی عجیب غریب صنعتوں میں مشہور تھے[4]

مسعودی نے ایک اہل علم و نظر جماعت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ... ہندوستان کی پیشانی ہمیشہ سے صلاحیت اور حکمت کا آئینہ رہی ہے۔ پھر ان کی الٰہیات، ریاضت اور کھیلوں کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد مسعودی نے کہا ہے کہ "ہندوستانی لوگ اپنی عقل سیاست، حکمت، رنگ اور اس کی صفائی، صحت مزاج، صفائے ذہن اور دقت نظر میں باقی تمام سیاہ فام لوگوں سے ممتاز ہے ہیں[5]۔

اصفہانی نے محاضرات الادباء میں لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کو حساب اور ہندی خطاطی اسرار طب، خطرناک بیماریوں کے علاج، منتر جنتر، علم الاوہام، سنگ تراشی، مجسمہ سازی تلوار سازی، شطرنج اور طرح طرح کے ناچ اور رقص اور سحر اور دھونیاں دما ناد وغیرہ چیزوں کا اچھا علم حاصل تھا۔

قفطی نے کہا ہے کہ وہ آٹھ قومیں جنھوں نے علم کی خدمت کی ہے یہ ہیں۔ ہندی ایرانی، کلدانی، یونانی، رومی، مصری، عربی، اور عبرانی۔ یہی وہ قومیں ہیں۔ جنھوں نے علم کی خدمت کی ہے۔ اور جنھوں نے نئے نئے علم پیدا کئے۔ باقی دوسری قومیں کچھ نہیں کر سکیں۔ اور نہ ہی ان کا کوئی علمی کارنامہ سامنے آیا[6]۔

صوبہ سرحد کی واحد موثر اواز
روزنامہ شہباز پشاور

اگر آپ صوبہ سرحد اور قبائل کے حالات سے باخبر رہنا چاہتے ہیں
اور سیاسی حالات کے پس منظر سے آگاہی چاہتے ہیں تو "شہباز"
کا مطالعہ کریں۔

یہی وہ روزنامہ ہے

جس کے پاس سرحد میں ٹیلی پرنٹر سروس ہے اے۔ پی۔ پی۔ رائٹر۔ ی۔ پی۔ اے، اور اپنے نامہ نگاروں کی خصوصی خبریں شائع کرتا ہے۔ اور با تصویر ہفت روزہ ایڈیشن شائع کرتا ہے۔

کراچی میں شہباز
طاہر بک ڈپو
ٹرام جنکشن۔ صدر روڈ کراچی سے دستیاب ہو سکتا ہے

[1] آغانی ج ۱۶ ص ۱۹ وطبقات الشعراء ابن قتیبہ [2] یہ رسالہ مجلۃ المقتبس جلد ششم شمارہ اول میں شائع ہوا ہے [3] یہ کتاب دار الکتب المصریہ از کتب سنقیطی میں موجود ہے [4] رسائل الجاحظ ص ۸۳ [5] مروج الذہب ج ۱ ص ۱۳۵ [6] اخبار الحکماء ص ۲۶

باب المراسلات

دور جدید کے صالحین

جیسا کہ طلوع اسلام میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ لکھا گیا تھا ہمارے دور سے پہلے ارباب مذہب کی یہ کیفیت تھی کہ وہ فریق مخالف کے معتقدات اور خیالات کو من و عن نقل کرتے تھے۔ اور پھر ان کی تردید کرتے تھے۔ یہ چیز دیانت داری پر مبنی تھی۔ لیکن ہمارے زمانہ میں ان لوگوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے۔ جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ گروہ امت کے منتخب صالحین کا گروہ ہے۔ لیکن ان کا وطیرہ یہ ہے کہ وہ فریق مخالف کے متعلق اپنے ذہن سے خیالات وضع کرتے ہیں۔ اور پھر ان کی بناء پر اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ فریق مخالف لاکھ کہے کہ یہ میرے خیالات نہیں ہیں۔ لیکن یہ اس کی کسی بات کو اپنے قارئین کے سامنے نہیں آنے دیتے اور اپنے پروپیگنڈے کو بدستور جاری رکھتے ہیں۔ یہ ہے وہ وطیرہ جو جماعت اسلامی نے طلوع اسلام کے خلاف اختیار کر رکھا ہے۔ اس باب میں اس جماعت کے عمائد و اراکین مثل ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ امین احسن اصلاحی صاحب یا نعیم صدیقی صاحب کیا کچھ کر رہے ہیں۔ اس کی بابت کئی بار لکھا جا چکا ہے۔ اب اسی ضمن میں ایک مثال ان کے متبعین کی بھی ملاحظہ کیجئے۔ لائلپور سے اس جماعت کا ایک اخبار "المنیر" شائع ہوتا ہے۔ ہم نے اس کے اڈیٹر کے نام ۱۸ اگست کو حسب ذیل خط لکھا۔

"محترمی مدیر المنیر! السلام علیکم!

"المنیر" کی اشاعت بابت ۱۰ اگست ۱۹۵۵ء میں محترم مولانا عبدالغفار حسن صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ سنت اور حدیث کے بارے میں طلوع اسلام کا موقف کیا ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ کسی صاحب نے طلوع اسلام کے موقف کو معلوم کرنے کی کوشش تو کی ورنہ آج تک ہوتا یہی چلا آیا ہے کہ طلوع اسلام کے موقف کے متعلق خود ہی ذہن میں کچھ فیصلہ کر لیا جاتا ہے اور پھر اس فیصلے کی بناء پر اسے مورد طعن و تشنیع بنا دیا جاتا ہے۔

طلوع اسلام نے اپنی اشاعت بابت ۲۰ اپریل کے لمعات میں نہایت وضاحت سے بتایا تھا کہ سنت کے بارے میں اس کا موقف کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ملک کے سنجیدہ طبقہ سے عرض کیا تھا کہ وہ براہ کرم اس موقف کو تنقیدی نگاہ سے دیکھیں۔ اور ان کے نزدیک جس مقام پر طلوع اسلام نے کوئی غلطی کی ہے اس سے اسے مطلع فرمائیں۔ تاکہ اگر ان کا خیال درست ہو تو طلوع اسلام اپنی اصلاح کر سکے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت تک کسی صاحب نے ایسا نہیں کیا۔ لیکن طلوع اسلام کے خلاف مختلف الزام تراشیوں کی مہم بدستور جاری ہے۔

(۲) ہم آپ سے اور آپ کے توسط سے مولانا عبدالغفار حسن صاحب سے درخواست کریں گے کہ آپ حضرات براہ کرم طلوع اسلام کے اس اداریٔ مقالہ کو اپنے اخبار میں من و عن شائع فرمائیں اور پھر اس میں جہاں جہاں غلطی نظر آئے اس پر تنقید فرما دیں۔ اس سے آپ کے قارئین کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ سنت کے بارے میں طلوع اسلام کا موقف کیا ہے۔ اور طلوع اسلام کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ آپ حضرات کے نزدیک اس موقف میں کیا غلطی ہے؟

کیا ہم توقع کریں کہ آپ ہماری اس درخواست کو شرف پذیرائی عنایت فرمائیں گے۔ نیز ہم نے اپنی اشاعت بابت ۱۸ مئی میں محترم عبدالغفار حسن صاحب سے حدیث و سنت کے متعلق کچھ سوالات کئے تھے۔ اور ان کے بعض فرمودات کی مزید تشریح چاہی تھی۔ ان کی طرف سے اس کا بھی کوئی جواب ہمیں آج تک موصول نہیں ہوا۔ ہم شکر گزار ہوں گے اگر آپ ان کی توجہ اس طرف بھی مبذول فرمائیں اور طلوع اسلام کے سوالات اور مولانا صاحب کے جوابات کو اپنے اخبار میں شائع فرما دیں۔

(۳) آپ کی سہولت کے لئے ایک پمفلٹ ارسال ہے جس میں صفحہ ۲ سے صفحہ ۳۱ تک طلوع اسلام کا وہ اداریٔ مقالہ درج ہے۔ جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، اور صفحہ ۳۲ سے صفحہ ۴۶ تک وہ استفسارات ہیں جو محترم عبدالغفار حسن صاحب سے کئے گئے۔ پمفلٹ کی وجہ سے یہ خط بصیغہ رجسٹری بھیجا جا رہا ہے۔

والسلام — مدیر

اس خط کا نہ کوئی جواب ہمیں موصول ہوا اور نہ ہی ہمارا یہ خط یا سنت رسول اللہ کے متعلق ہمارا مضمون اس میں شائع ہوا ۱۳ ستمبر کو ان کی خدمت میں یاد دہانی کے لئے ایک کارڈ لکھا گیا لیکن وہ بھی صدا بصحرا ثابت ہوا۔

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ کس قسم کی دیانت اور صالحیت ہے جس سے ہمارے زمانہ کے بدنصیب مسلمانوں کو پالا پڑا ہے!

اقبال کو سمجھنے کیلئے
اقبال اور قرآن
کا مطالعہ کیجئے
قیمت :- دو روپے

حقائق و عبر

نادان دوست

ہم نے اگست کی اشاعت کے حقائق و عبر میں یہ بتایا تھا کہ ارباب مذہب کس طرح کمزور دلائل اور رکیک تاویلات سے بزعم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے لیکن اس کے نتائج اس کے بالکل برعکس ہوتے ہیں۔ اور مغرب کے ارباب علم و فکر جب اس قسم کے کمزور دلائل کو دیکھتے ہیں تو ان کے دل سے اسلام کا احترام اٹھ جاتا ہے۔ وہ اسے بھی دیگر مذاہب کی طرح توہم پرستیوں اور چیستانوں کا مجموعہ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن یہ چیز ہمارے ارباب مذہب ہی سے مختص نہیں۔ ہمارے ہاں مغربی تعلیم یافتہ لیڈر قسم کے لوگوں کا بھی ایک طبقہ ایسا ہے جو اپنی اس قسم کی جہل پاشیوں سے اسلام کو بدنام کرتا پھرتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے سامنے اسوقت پاکستان ٹائمز (لاہور) کا پانچ ستمبر کا پرچہ ہے۔ جس میں لندن کے ایک اسلامی اجتماع کی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس اجتماع میں ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی نے تقریر فرمائی تھی۔ قریشی صاحب یہاں کا قلمدان وزارت چھن جانے کے بعد کولمبیا یونیورسٹی میں تاریخ اسلام کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان کی تقریر کا عنوان تھا "اسلام میں احترام آدمیت" اس ضمن میں انھوں نے حسب معمول یہ غیر قرآنی تصور پیش کیا کہ انسان صفحہ ارض پر خدا کا خلیفہ ہے۔ تقریر کے بعد ایک خاتون نے یہ سوال پوچھا کہ اسلام نے غلامی جیسے ملعون رسم کو کیسے روا رکھا؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب صاف الفاظ میں یہ تھا کہ قرآن نے غلامی کے ہر دروازے کو بند کر دیا ہے۔ اگر ہمیں بعد میں مسلمان بادشاہوں کے ہاں غلام اور لونڈیاں نظر آتی ہیں تو ان کا یہ فعل قرآن کے خلاف ہے۔ جس کی ذمہ داری اسلام پر عاید نہیں ہوتی لیکن قریشی صاحب کو کیا معلوم کہ قرآن کی تعلیم کیا ہے اور اسلام کیا کہتا ہے انھوں نے نہایت لجلجاتے، شرماتے ہوئے کہا کہ دنیا کے کسی بڑے مذہب نے بھی براہ راست غلامی کی مخالفت نہیں کی اور وہ معاشرتی حالات جن میں اسلام کا ظہور ہوا۔ ان میں غلامی کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ اسلام نے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دے کر غلاموں پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

اس کے بعد کسی نے یہ پوچھا کہ مسلمانوں کے ممالک میں نظام جاگیرداری کے متعلق ان کا کیا خیال ہے۔ اس کا جواب انھوں نے نہایت گول مول الفاظ میں دیا۔ حالانکہ کہنے کی بات یہ تھی کہ یہ انہی غیر اسلامی لعنتوں میں سے ایک لعنت ہے جسے مسلمانوں نے اپنے ہاں اختیار کر رکھا ہے۔ اسلام کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

اسی سلسلہ میں جمہوریت کا ذکر آگیا تو انھوں نے فرمایا کہ ازمنہ متوسط کے مسلمان بادشاہوں نے اپنی رعایا کو اس قدر مراعات دے رکھی تھیں کہ ان کے دل میں جمہوریت کا خیال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر قریشی صاحب نے ان بادشاہوں کی شخصی حکومت کو "احسان عظیم" سے تعبیر کیا۔

وہاں ایک کونہ میں کوئی پاکستانی طالب علم بیٹھا تھا۔ اس نے سوال کیا کہ کیا آج اسلامی ممالک میں مزدور طبقہ کو وہی آسائشیں اور مراعات حاصل ہیں جو اس طبقہ کو اشتراکی ممالک یا کم از کم برطانیہ جیسے ملکوں میں حاصل ہیں۔ اگر انھیں یہ مراعات حاصل نہیں تو پھر پروفیسر صاحب اسلام میں احترام آدمیت کا کیا چرچا فرما رہے ہیں! اس کے جواب میں قریشی صاحب نے فرمایا کہ اس سوال کو دو نقاط نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ ایک آزادی وہ ہوتی ہے جسے معاشی آزادی کہا جاتا ہے اور ایک احترام وہ ہوتا ہے جو کسی کو معاشرہ میں حاصل ہو۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اسلامی ممالک میں محنت کش طبقہ کو معاشی آزادی تو حاصل نہیں لیکن معاشرہ میں انہیں مساوات کا درجہ حاصل ہے۔ یعنی ایک ملازم کے لئے یہ اعزاز کچھ کم باعث شرف نہیں کہ وہ نماز میں اپنے آقا کے برابر کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اسے اس کی شکایت ہرگز نہیں کرنا چاہیئے کہ اسے محض روٹی کی خاطر عمر بھر اس آقا کے جوتے کھانے پڑتے ہیں۔

یہ ہے وہ اسلام جس کا مظاہرہ ہمارے اس جاہل تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے یورپ اور امریکہ میں آئے دن ہوتا رہتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ان حضرات کو اسلام کی صحیح تعلیم کے متعلق کچھ بھی علم نہیں تو پھر یہ اسلام پر گفتگو اور تقریر کرنے کی جرات کیوں کر لیتے ہیں؟ اگر ڈاکٹر قریشی صاحب سے یہ پوچھا جائے کہ ہائیڈروجن بم کس طرح تیار ہوتا ہے تو وہ بلا تامل کہدیتے کہ یہ میرا موضوع نہیں۔ اس لئے اس کے متعلق مجھے معلومات حاصل نہیں ہیں لیکن جب ان سے اسلام کے متعلق سوالات پوچھے جائیں تو وہ کبھی نہیں کہیں گے کہ اس کے متعلق میری معلومات کافی نہیں ہیں۔ وہ ایک اتھارٹی بن کر کھڑے ہو جائیں گے اور جو جی میں آئے اسے اسلام کی طرف منسوب کر کے سامعین پر اپنے تبحر علمی کی دھاک بٹھانے کی کوشش کریں گے۔

یہ لوگ درحقیقت اسلام کو ہمارے ان پڑھ مولویوں سے بھی زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس لئے کہ مولویوں کی بات زیادہ تر ان کے مقدس کنویں کے دائرہ کے اندر ہی رہتی ہے۔ الا یہ کہ کوئی مستشرق اسے خاص طور پر اپنے ہاں لے جائے۔ لیکن ہمارے ان پروفیسروں کی زبان سے نکلی ہوئی بات ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔

اہل مغرب کے سامنے صحیح قرآنی اسلام کو پیش کرنے کی کتنی بڑی ضرورت ہے:

منحوس ۱۹۵۷ء

معاصر "پاسبان" (ڈھاکہ) کی ۵ ستمبر کی اشاعت میں ذیل کی دلچسپ رپورٹ شائع ہوئی ہے:

"۱۹۵۷ء کی آمد آمد کے ساتھ یہاں بھارت کے مستقبل کے متعلق مایوسی اور پریشانی کا بھی اظہار کیا جا رہا ہے اور یہ اندیشہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ جس طرح پچھلی صدیوں کا ۵۷ واں سال بھارت کے لئے منحوس ثابت ہوتا رہا ہے۔ اسی طرح اس صدی کا ۵۷ واں سال بھی منحوس ثابت ہوگا۔ عوام کے علاوہ خواص بھی اس قسم کے خیالات سے متاثر ہیں۔ اس سال کی نحوست سے بچنے کے لئے کچھ تدبیریں بھی کی جا رہی ہیں۔ جیتشی اور متھلا کے پنڈتوں کا خیال ہے کہ بھارت کے لئے نحوست ۱۹۵۵ء ہی سے شروع ہو جائے گی جو ۱۹۵۷ء تک جاری رہے گی۔ اور بالآخر دہلی کی حکومت کا خاتمہ ہو کر رہے گا۔ کہا جاتا ہے کہ اس عرصہ میں قحط، وبائیں، قتل و غارت گری، خانہ جنگی اور اس طرح کی دوسری مصیبتیں نازل ہونگی۔ چنانچہ سکھوں کی سکھستان کی تحریک۔ ڈراوڑوں کا ڈراوڑستان اور مختلف ریاستوں کے درمیان تنازعات و رسہ کشی کو انھیں تباہ کاریوں کا پیش خیمہ بتایا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بھارت کی پچھلی تباہیوں کا بڑا سبب یہی رہا ہے کہ مختلف ریاستیں آپس میں ٹکرائی ہیں۔ چنانچہ اب پھر یہی ذہنیت ابھر رہی ہے اور مختلف ریاستیں آپس میں نبرد آزما ہونے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔

ان خیالات سے بھارتی مورخین بھی متفق نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۵۵۶ء میں پانی پت کے میدان میں ہیمو بقال نے

قوت ارادی
پروفیسر ظہوری

زندگی کے خاردار راستے میں وقار و طمانیت سے بڑھتے رہیئے اور اس سفر میں یہ نہ بھولئے کہ صبر، جوش، ولولہ اور استقامت ہی وہ قوتیں ہیں جو کامیابی و کامرانی میں مدد دیتی ہیں۔ عزم آہنی نئے ولولے اور بے پناہ حوصلے کو ہمیشہ اپنے قلب و دماغ میں سمائے رکھئے۔ اور اپنے ارادوں پر کامل یقین رکھئے بس یہی قوت ارادی ہے یہی وہ بیش بہا طاقت ہے جس کے سامنے پہاڑ ذرہ اور سمندر ریگستان بن جاتا ہے۔ اس حیرت انگیز کرشمہ ساز اور لازوال قوت کو حاصل کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

مجلد رنگین گرد پوش۔ قیمت تین روپیہ

بچوں کی دیکھ بھال
مترجمہ مسلم ضیائی ایم اے

آج ہر محب وطن باپ کے کندھوں پر یہ بھاری ذمہ داری ہے کہ وہ بچے کی جسمانی اور اخلاقی تربیت صحیح طور پر کرے۔ بچے کا دل، دماغ اور زندگی اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے ایک عظیم الشان قومی اور سماجی عمارت کی بنیاد ہے۔ یہ کتاب والدین کی صحیح رہنمائی کرتی ہے۔

مجلد رنگین گرد پوش۔ قیمت چار روپیہ

شعور و لاشعور — سلامہ موسیٰ مصری — 3—4—0
نوجوانوں کی نفسیات — ڈاکٹر عسکر — 3—/2—0
کامیاب جنسی زندگی — بدر شکیب — 3—/2—0

نفیس اکیڈیمی بلاسس اسٹریٹ۔ کراچی

بھارت سے مسلم سلطنت ختم کرنے کی کوشش کی اور اسے پیش صف آرا ہوا۔ لیکن شکست فاش کھائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی صدی تک کیلئے بھارت میں مسلم حکومت مضبوط و مستحکم ہو گئی۔ پھر ۱۶۵۸ء میں سامو گڑھ کی لڑائی ہوئی۔ جس میں اورنگ زیب کو فتح ہوئی۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ ہوئی۔ اور بھارت میں انگریزی راج کو تقویت ملی۔ ساتھ ہی متھرا اور دہلی کی غارت گری بھی ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں جو کچھ ہوا وہ محتاج بیان نہیں۔ ہندوستان میں جابر و قاہر انگریزی راج قائم ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان تمام مواقع پر دہلی تباہ ہوتی رہی۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اس کی خیر نہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ خود بھارتی حکومت بھی ان خیالات سے متاثر ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وہ پہلا اقدام یہ کر رہی ہے کہ دارالحکومت دہلی سے الٰہ آباد بھیجا جا رہا ہے۔ رپورٹ ملی ہے کہ سینٹرل سکریٹری الٰہ آباد منتقل کیا جانے والا ہے۔ اس کے علاوہ راج بھون (صدر جمہوریہ کی رہائش گاہ) کے متعلق یہ انتظام کیا گیا ہے کہ سال میں چھ ماہ دہلی اور چھ ماہ حیدرآباد دکن میں رہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ۱۹۵۷ء کا پورا سال صدر جمہوریہ دہلی سے باہر ہی گذار دیں۔ بھارتی حکومت نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ ۱۹۵۷ء کو سنہ ۱۹۵۶ء ہی کہا جائے گا۔ تاکہ ۱۹۵۷ء کا نام ہی نہ لینا پڑے۔

پنڈتوں کا کہنا ہے کہ اس دور میں ایک طرف تو ہندو حکومت اور ہندو اثرات کو دھکا لگے گا۔ بلکہ تباہی سے قریب ہوں گے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں تنظیم اور استحکام پیدا ہو گا اور ان کی تاریخ ایک نئی کروٹ لے گی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ برصغیر پر مسلم اقتدار قائم ہونے کی امید ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ رپورٹ کسی زرخیز دماغ کی اپج دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ہندو جیسی توہم پرست قوم سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ۵۷ء کی نحوست کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور لے لے اور چونکہ اس قسم کے نفسیاتی اثرات متعدی ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر وہاں کے کسی مختصر گروہ نے بھی یہ اثر لے لیا تو اس قدر کا ملک بھر میں پھیل جانا کچھ بعید نہیں۔ جو قوم ابھی تک پیپل اور گنگا کی عظمت کی گرفت سے نہیں چھوٹ سکی۔ وہ سعد و نحس کے چنگل سے کس طرح نکل سکتی ہے۔

لیکن اس سے مسلمانوں کو کسی طرح بھی خوش نہیں ہونا چاہیئے۔ یا اس اسلام کا دعوے کرنے کے باوجود جو دنیا سے ہر قسم کی توہم پرستیوں کو مٹانے آیا تھا ہزار قسم کی توہم پرستیوں اور انسان پرستیوں میں پھنسی ہوئی ہے لہٰذا اس کے لئے دوسروں کی جہالت پر خوش ہونے کا کیا جواز ہے۔

طلوع اسلام کثیر تعداد میں شائع ہو کر پاکستان، ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک میں ہر طبقہ کے لوگوں کے پاس جاتا ہے۔ اس میں چھپنے والے اشتہارات ہزاروں خریداروں کی نظروں سے گزرتے ہیں۔
نرخ نامہ اشتہارات و تفصیلات ناظم ادارہ، شعبہ اشتہارات سے حاصل کیجئے
ناظم ادارہ طلوع اسلام
پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ ـــــ کراچی

نقد و نظر

کتاب التوحید

مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات بڑا سائز۔ قیمت مجلد تین روپے۔

زیر تبصرہ کتاب علامہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی تصنیف ہے۔ جس میں موصوف نے جاہلانہ شرکیہ رسوم و بدعات مثلاً قبر و قبہ پرستی، تعویذ گنڈے۔ فال اور شگون لینا۔ غیر اللہ کے لئے نذریں اور نیاز دینا وغیرہ مسائل کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ جو توحید کے خلاف ہیں۔ علامہ موصوف تیرھویں صدی ہجری کے ان مصلحین میں سے ہیں۔ جنھوں نے اپنے زمانہ اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اور جن کی مساعی ایک بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ یہ دور مسلمانوں میں بیداری کا دور شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی دور میں ایران اور مصر میں جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ پیدا ہوئے۔ ترکی میں مدحت پاشا اور مصطفےٰ کمال نے جنم لیا اور تیونس میں خیر الدین پاشا تونسی اور ہندوستان میں سید احمد خان کا ظہور ہوا۔ لیکن بقول محترم احمد امین صاحب مصری عجیب بات ہے کہ تمام اسلامی ممالک میں اعراض مرض ملتے جلتے تھے۔ کیونکہ جن حوادث سے ان ممالک کو دوچار ہونا پڑا وہ یکساں تھے۔ مصلحین بھی اصل مادۂ اصلاح میں ایک دوسرے سے متماثل نظر آتے ہیں تاہم ان کی اصلاح کے طریقے اپنے اپنے ماحول اور حالات و کوائف کے ماتحت ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ چنانچہ محمد بن عبدالوہاب کی اصلاح کارانہ مساعی بدویت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں جو ایک بدوی ماحول ہی سے مناسبت رکھتی تھیں۔ انہی کے نقش قدم پر سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ بھی چلے۔ لیکن ان دونوں اصلاحات میں حضارت اور مدنیت کا رنگ زیادہ جھلکتا تھا۔ مدحت پاشا اور خیر الدین تونسی کی اصلاحات مدنی اصلاحات تھیں۔ چنانچہ نظام حکومت وغیرہ میں یورپ کا اقتدار کہا گیا تھا۔ اور نوجوان ترکی میں مصطفےٰ کمال کی اصلاحات خالص یورپین اصلاحات تھیں۔ جن میں یہ دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ ان معاملات میں اسلام کے مطالبات کو بھی نظر میں رکھا جاتا۔ (یوم الاسلام ص ۱۳۲)

محمد بن عبدالوہاب کی اصلاحات کو سمجھنے کے لئے محترم امین احمد مصری کے الفاظ میں اتنا ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ محمد بن عبدالوہاب کا ظہور حجاز میں ہوا تھا۔ وہ قبیلہ بنو تمیم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا ظہور اٹھارویں صدی کے آخر میں ہوا تھا ان کی اصلاحات کی اہم ترین بنیاد قرآن کریم اور سنت نبویہ کی طرف لوٹنا تھا۔ حدیث پر انھوں نے بہت زیادہ کلی اعتماد کیا اور ان فقہائے سابقین کے برعکس جو رائے پر بھی اعتماد کر لیتے تھے۔ امام احمد بن حنبل کے مسلک کو اپنا راہنما قرار دیا۔ جس کی بنیاد خالص حدیث تھی یہ ابن تیمیہ کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ ان سب باتوں نے انھیں اس رائے پر جما دیا تھا کہ اسلام اپنی اصلی صورت پر باقی نہیں رہا۔ اور ترکوں نے اسلام میں بہت سی برائیاں ملادی ہیں۔ انھوں نے زناکاروں کو از سر نو رجم کرنا شروع کر دیا۔ قبروں اور مزارات کو ڈھا دیا۔ مسجدوں میں زینت و آرائش کو حرام قرار دیا۔ اور نشہ آور چیزوں اور حقہ اور سگریٹ نوشی پر سختی برتی۔ ان کی تعلیمات نے حجاز میں ان کے بہت سے مددگار اور بے شمار مرید پیدا کر دیئے تھے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی اصلاحی حرکت میں وہ تشدد اور خشونت نمایاں طور پر موجود تھی جو ایک بدوی ماحول کا خاصہ ہوا کرتی ہے۔

(یوم الاسلام ص ۱۱۸)

حدیث کے بارے میں ان کا بہرحال یہی مسلک ہو سکتا تھا کہ جو حدیث اصول روایت کی رو سے صحیح قرار پا جائے اسے صحیح سمجھا جائے۔ خواہ درایتاً اس کی پوزیشن کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کتاب میں اس قسم کی حدیثیں موجود ہیں کہ

ابن مسعود کہتے ہیں کہ پہلے اور دوسرے آسمان میں پانچ سو برس کا فاصلہ ہے۔ اور ہر دو آسمانوں میں پانچسو برس کا فاصلہ ہے۔ ساتویں آسمان اور کرسی میں بھی پانچسو برس کا فاصلہ اور کرسی اور پانی میں پانچسو برس کا فاصلہ ہے اور عرش پانی پر ہے اور اللہ تعالیٰ اسی عرش پر۔ (ص ۱۳۳)

بہرحال جن حضرات کو مشرکانہ رسوم اور بدعات وغیرہ کے متعلق اہل حدیث کا مسلک دیکھنا مقصود ہو۔ ان کے لئے یہ کتاب مفید ہو گی۔

لغات القرآن (صحیح)

نور محمد، کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی کی طرف سے شائع کردہ ایک آسان اور مختصر لغات قرآن۔ اس میں قرآن کریم کے تمام الفاظ (جس جس شکل میں وہ آئے ہیں) حروف تہجی کے ترتیب کے ساتھ دیئے گئے ہیں اور ان کے سامنے وہ معانی دیئے گئے ہیں جو ہمارے یہاں کے مروجہ قرآنی تراجم میں ملتے ہیں۔ مثلاً ذَكَرَ (ذ کے نیچے ہے۔ تَذْكُرُونَ (ت کے نیچے۔ يَذْكُرُونَ (ی کے نیچے۔ اور ان کے معانی ہیں۔ ذَكَرَ۔ اس نے یاد کیا۔ تَذْكُرُونَ تم یاد کرو گے يَذْكُرُونَ۔ وہ یاد کرتے ہیں یا یاد کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا لغت محض مبتدیوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

طباعت کتابت صاف۔ تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۲۰۴ صفحات قیمت مجلد بہ خوبصورت ڈسٹ کور چار روپے۔

نوادرات
(از علامہ اسلم جیراجپوری)
قیمت
چار روپے

تاریخ الامّت

علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ کی تاریخ کی وہ بے مثل کتاب جو تقسیم سے پہلے بیشتر درسگاہوں میں بطور نصاب شامل تھی۔ اب مولف کی اجازت سے طلوع اسلام نے اسے دوبارہ چھاپا ہے۔

قیمت حصہ اول (سیرت رسول اللہ صلعم) دو روپے۔

قیمت حصہ دوم (خلافت راشدہ) دو روپے آٹھ آنے۔

کتاب آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ باقی حصے عنقریب شائع ہو جائینگے۔

اقبال اور قرآن

اقبال نے قرآنی انقلاب کی آواز سے فضا کو معمور کیا۔

قرآن کیا کہتا ہے اور اقبال کا پیغام کیا ہے؟

ان کے جوابات مفسر قرآن اور ترجمان اقبال پرویز سے سنئے۔

ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت دو روپے

ابلیس و آدم

سب سے پہلا انسان کس طرح معرض وجود میں آیا؟ آدم اور خلافت آدم کا مفہوم کیا ہے۔ ابلیس کیا ہے اور آویزش ابلیس و آدم کیا؟ وحی کیا ہے اور وحی نے انسان کو کیا عطا کیا؟ ان سوالات کے قرآنی جوابات اس کتاب میں دیکھئے۔

صفحات ۳۷۶ قیمت آٹھ روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام ـ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۴ ـ کراچی ـ ۳

الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ

[illegible]

یعنی اس قرآنی معاشرہ کا جس کا [illegible]

مستقل اقدار

[illegible]

خوشنودی [illegible] کے لئے [illegible]

[illegible] کی فکر میں لگ جائے۔

یہی معاشرہ

کیسے قائم ہوسکتا ہے ۔

اس کا جواب

نظامِ ربوبیت

([illegible])

میں ملاحظہ کیجئے

دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب

قسم اول [illegible] روپے

قسم دوم [illegible] کے ساتھ [illegible] روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام [illegible] کراچی

[illegible] Art Press, [illegible] Bunder Road, Karachi. [illegible] Press [illegible] Karachi. Published by [illegible]
from Tolu-e-Islam Office, 25/1 Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM